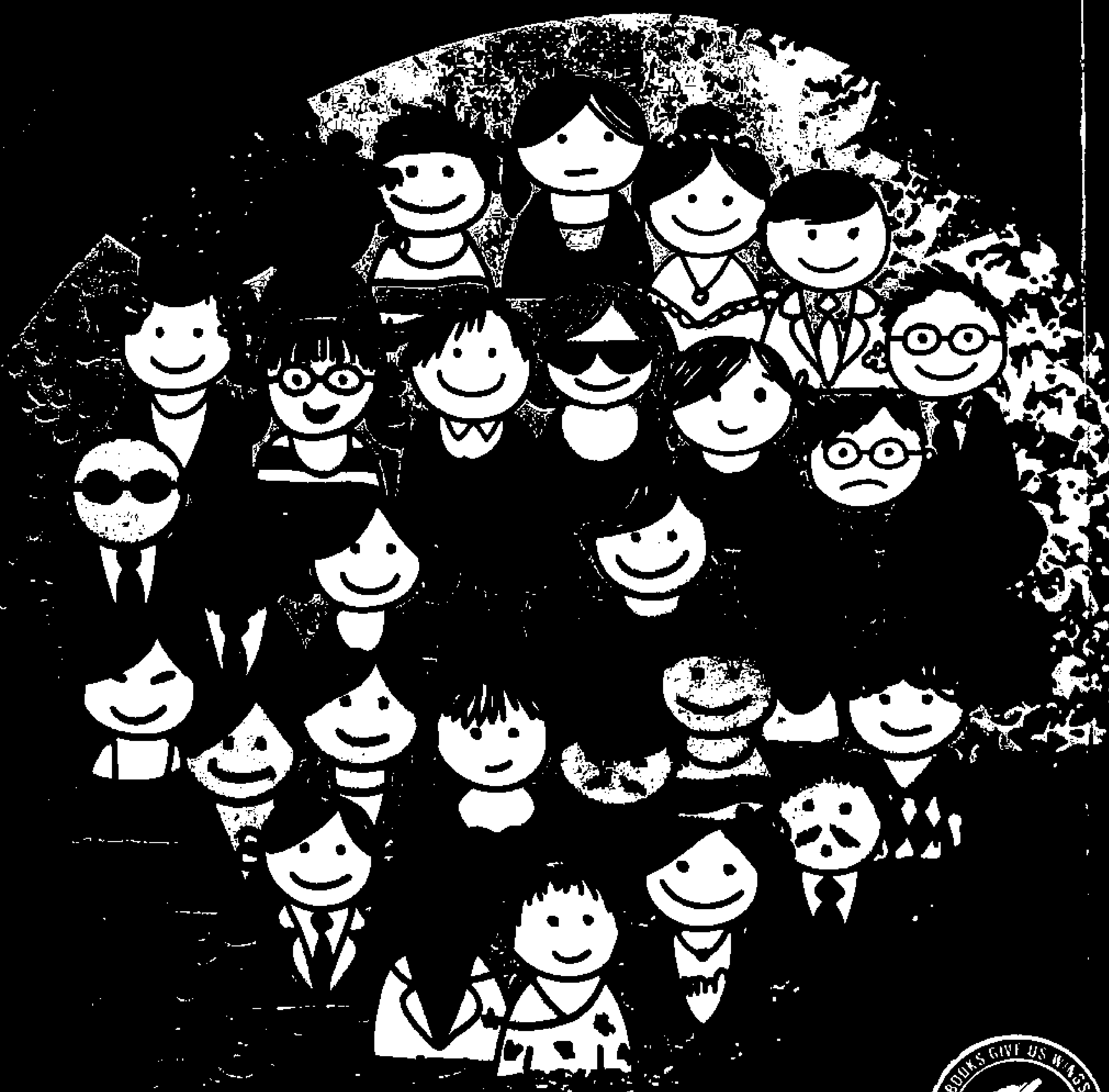
عام لوگوں کی خاص کہانیاں

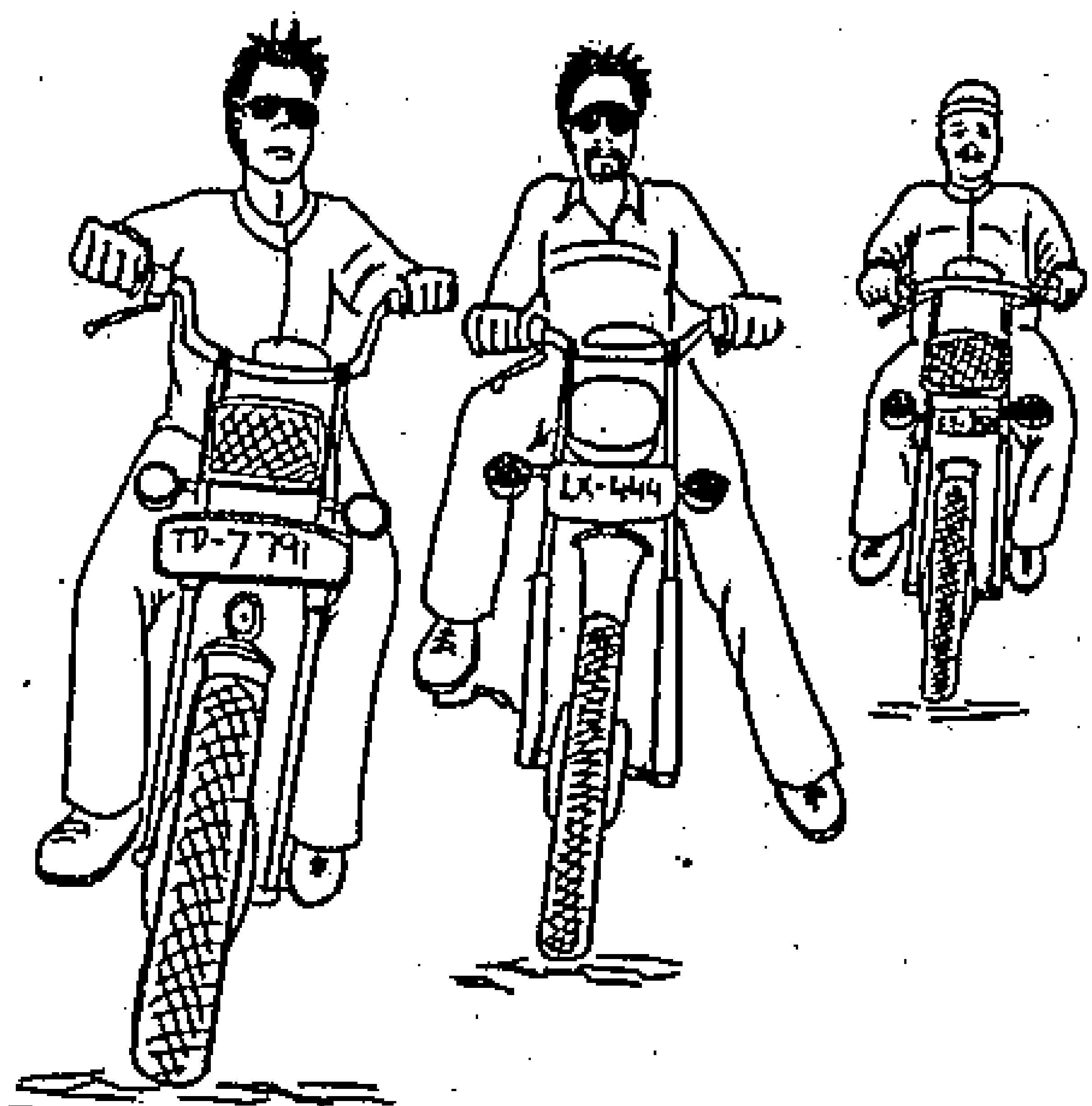


BOOKS GIVE US WINGS
NATIONAL BOOK FOUNDATION



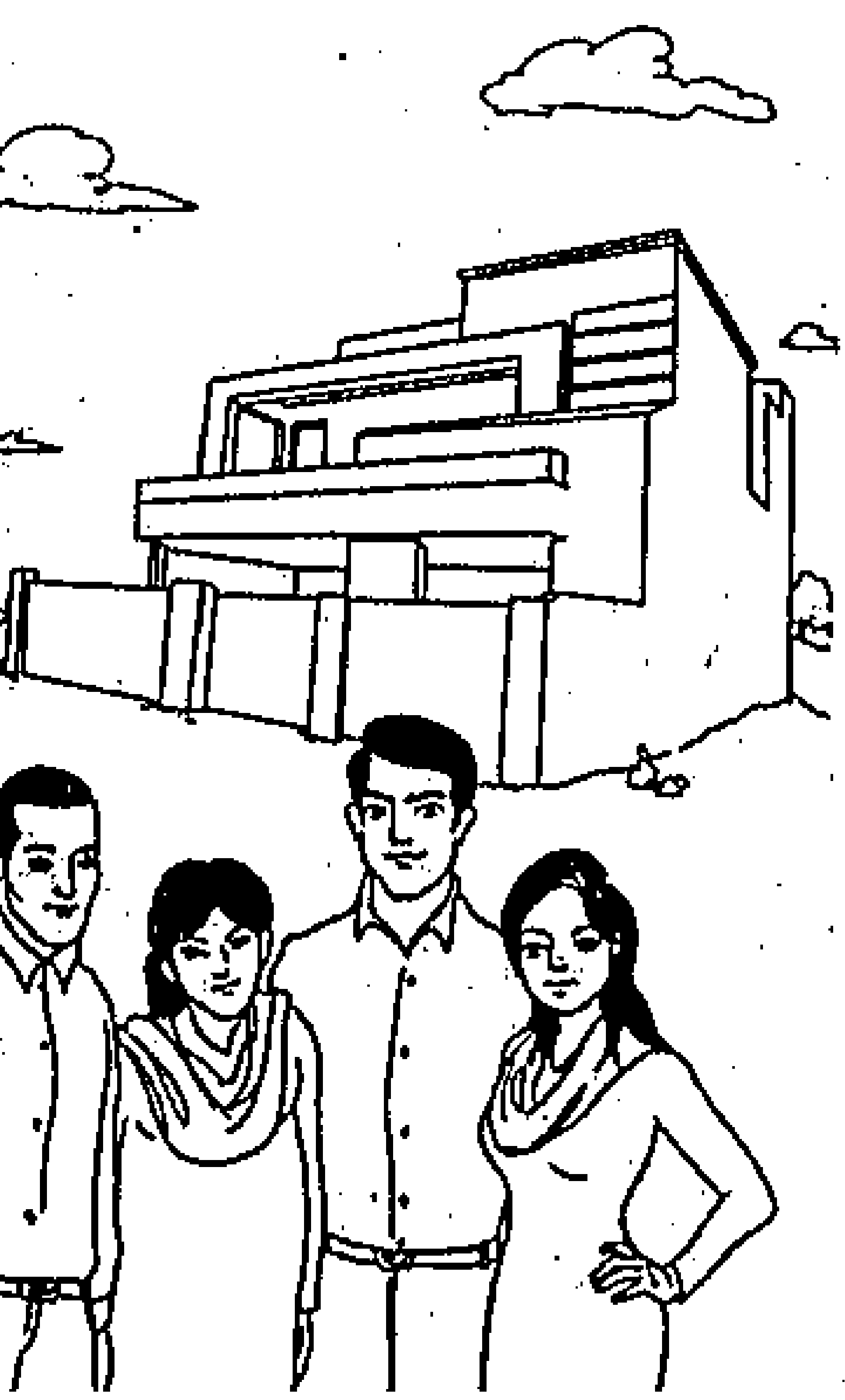


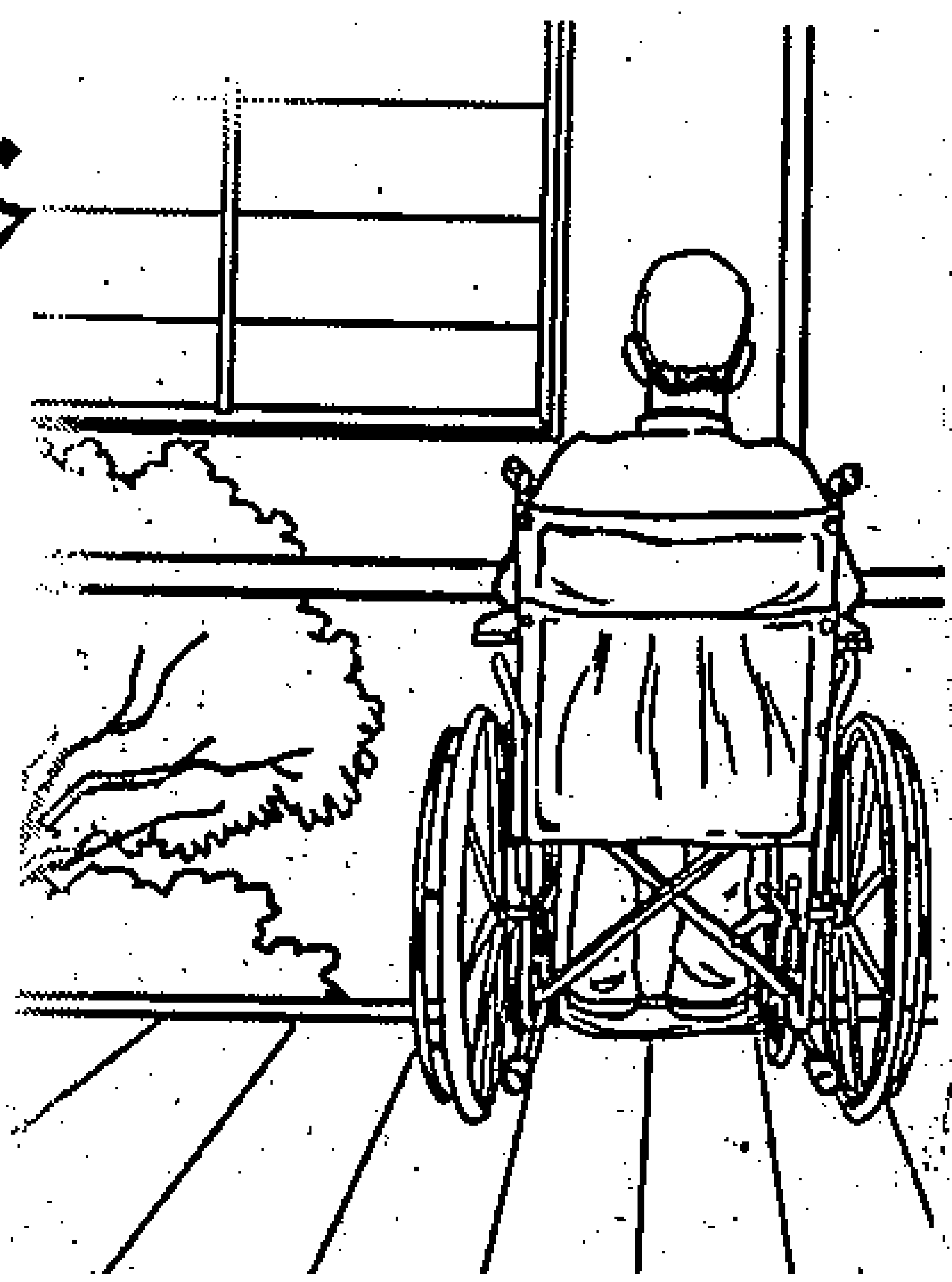
بڑے بچوں کی
کردار سازی اور شخصیت سازی
کے لیے ایک مفید کتاب



NATIONAL BOOK FOUNDATION
امن انقلاب
بذریعہ کتاب
BOOK REVOLUTION

عام لوگوں کی
خاص کہانیاں

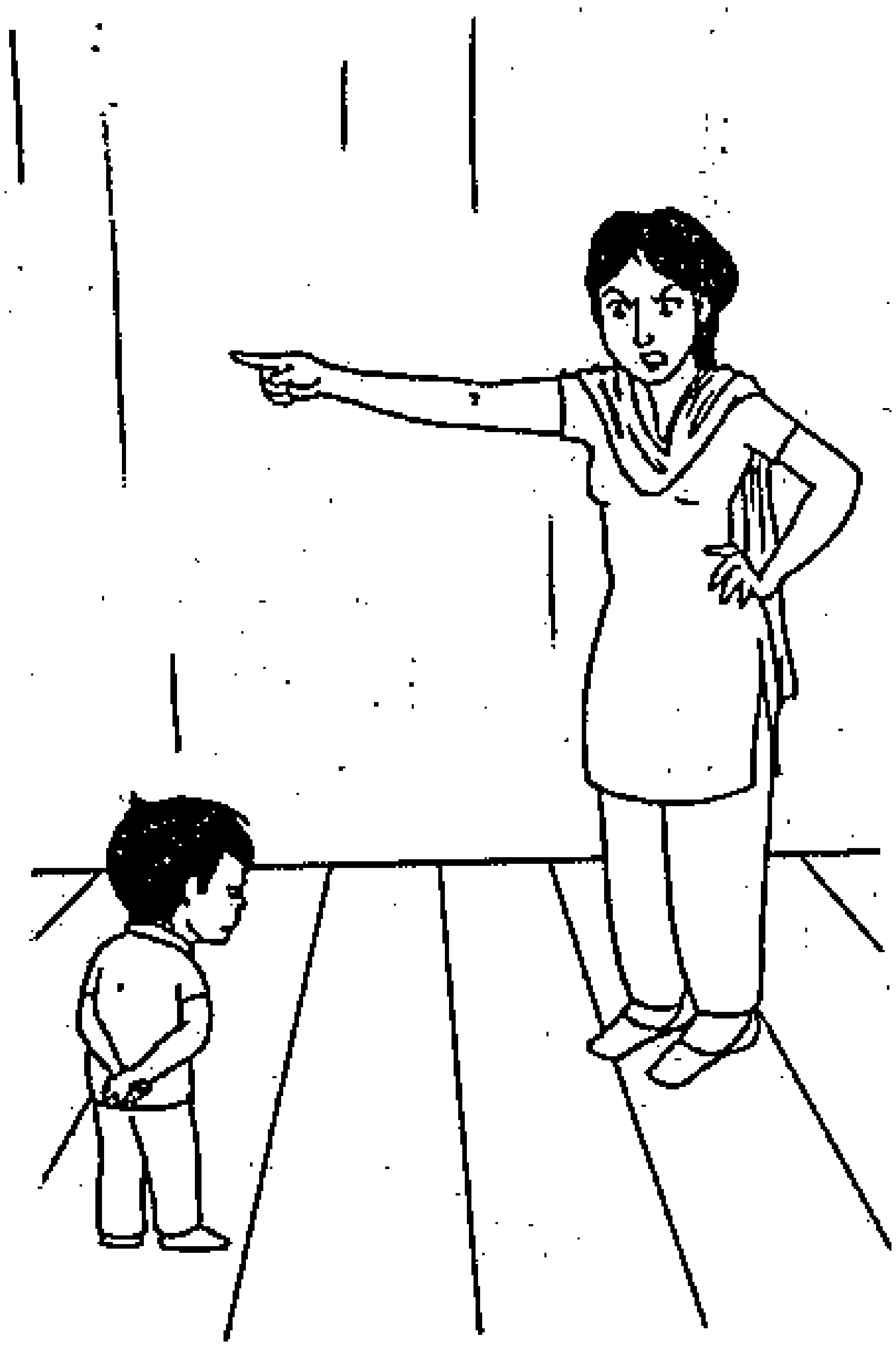








بڑے بچوں کی
کردار سازی اور شخصیت سازی
کے لیے ایک مفید کتاب



عام لوگوں کی
خاص کہانیاں

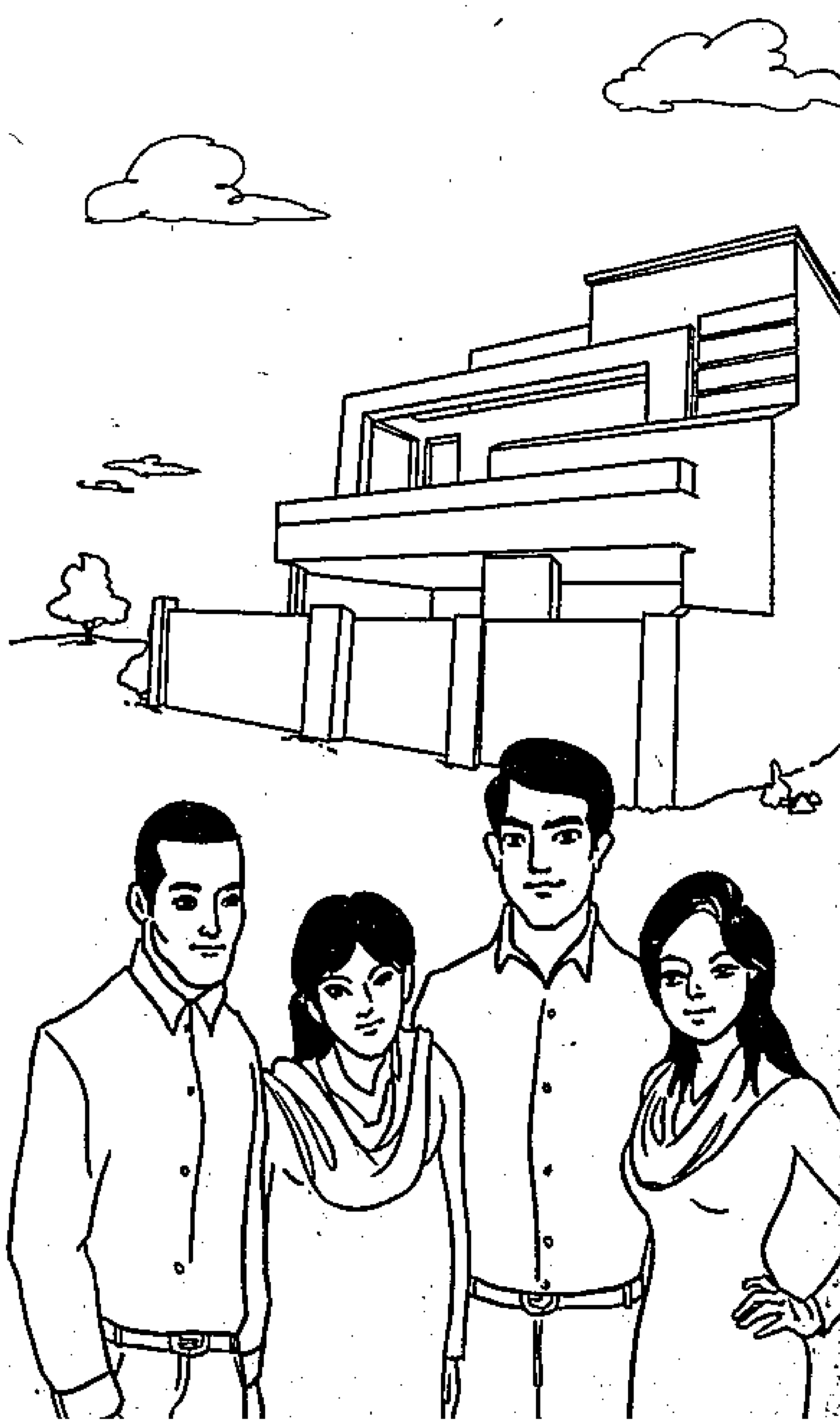


NATIONAL BOOK FOUNDATION
امن انقلاب بذریعہ کتاب
BOOK REVOLUTION



عام لوگوں کی خاص کہانیاں

جواد اقبال جواد



نیشنل بک فاؤنڈیشن

اسلام آباد





نگران	:	ڈاکٹر انعام الحق جاوید
نام کتاب	:	عام لوگوں کی خاص کہانیاں
مصنف	:	جواد اقبال جواد
آرٹسٹ	:	محمد رفیع، ثنا ندیم
اشاعت	:	مارچ 2015ء (تعداد: 1000)
اشاعت دوم	:	اکتوبر 2015ء (تعداد: 2000)
کوڈ نمبر	:	GNU-499
آئی ایس بی این	:	978-969-37-0754-0
طابع	:	فرحان رضا پرنٹرز، راولپنڈی
قیمت	:	-/60 روپے

نیشنل بک فاؤنڈیشن کی مطبوعات کے بارے میں مزید معلومات کے لیے رابطہ:

ویب سائٹ: http/www.nbf.org.pk یا فون 92-51-9261125+

یا ای میل: books@nbf.org.pk

فہرست







نگران : ڈاکٹر انعام الحق جاوید

نام کتاب : عام لوگوں کی خاص کہانیاں

مصنف : جواد اقبال جواد

آرٹسٹ : محمد رفیع، ثنا ندیم

اشاعت : مارچ 2015ء (تعداد: 1000)

اشاعت دوم : اکتوبر 2015ء (تعداد: 2000)

کوڈ نمبر : GNU-499

آئی ایس بی این : 978-969-37-0754-0

طابع : فرحان رضا پرنٹرز، راولپنڈی

قیمت : -/60 روپے

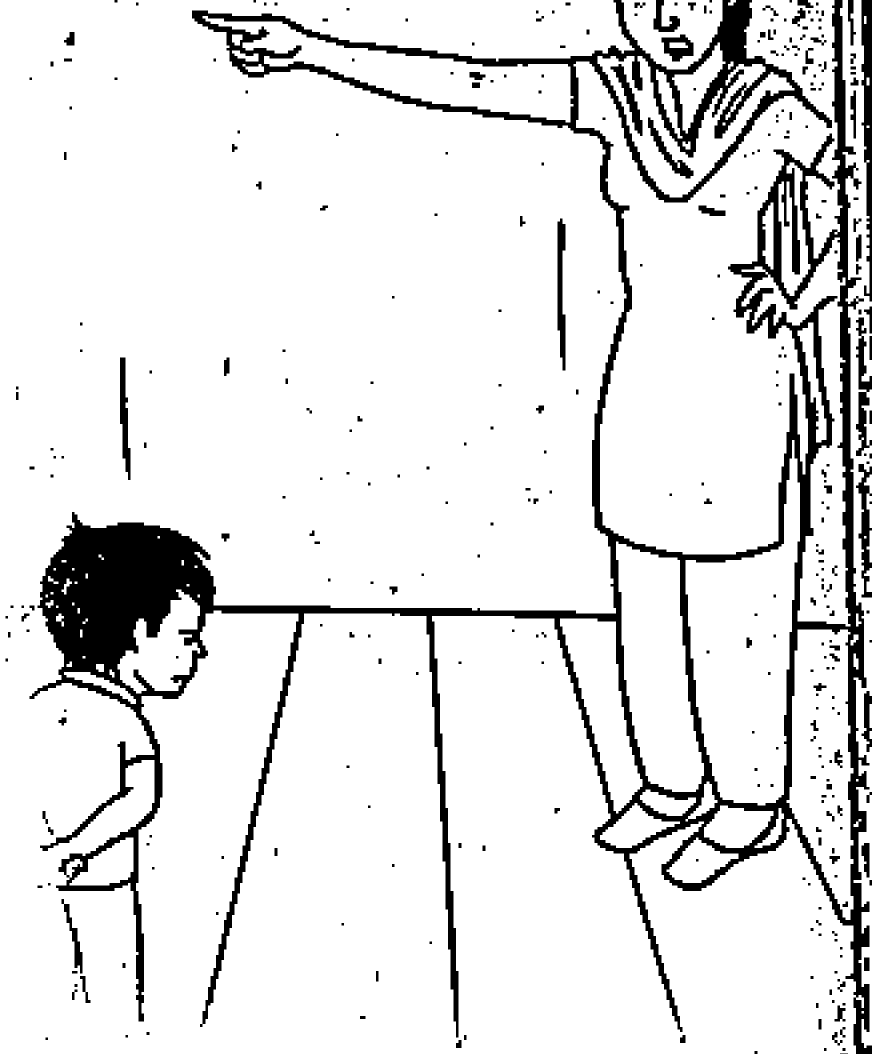
نیشنل بک فاؤنڈیشن کی مطبوعات کے بارے میں مزید معلومات کے لیے رابطہ:

ویب سائٹ: http/www.nbf.org.pk یا فون 92-51-9261125+

یا ای میل: books@nbf.org.pk

فہرست





پیش لفظ

(ا)

کتاب دوستی اور مطالعے کا شوق ہر دور میں انسان کی بہتر تعلیم و تربیت اور شخصیت سازی کے لئے ضروری رہا ہے مگر موجودہ دور میں اس ذوق وشوق کی آبیاری کی زیادہ ضرورت ہے کیونکہ ذہنی تفریح اور معلومات کے ذرائع بدل چکے ہیں۔ سادہ الفاظ میں بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہم ''ڈاٹ کام'' دور میں رہ رہے ہیں۔ ایسے میں ایک غلط فہمی یہ بھی پیدا ہوئی ہے کہ شائد کتاب اپنی اہمیت کھو رہی ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ علم، حکمت اور ادب کے موتیوں کو کتابی شکل میں لا کر ہی سند کے ساتھ محفوظ اور اگلی نسلوں تک منتقل کیا جا سکتا ہے۔ نیشنل بک فاؤنڈیشن اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہے اور نئی نسل میں کتاب دوستی کے فروغ کے لئے منظّم انداز میں کوشاں ہے۔ مذکورہ تناظر میں ادارے کی یہ کوشش رہی ہے کہ اُن ادب پاروں اور مصنفین کو بھی سامنے آنے کا موقع دیا جائے جو بچوں اور نوجوانوں سے متعلق لکھ رہے ہیں۔ ایسے میں نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی اور ان کے اچھے کام کی طباعت ہماری ترجیحات میں شامل رہی ہے۔

" عام لوگوں کی خاص کہانیاں" بھی ایک نوجوان شاعر اور ادیب کی تخلیقی کاوش ہے جس میں نئی نسل کی شخصیت سازی کو خاص طور پر ملحوظ رکھا گیا ہے۔ یہ کہانیاں موجودہ دور میں مثبت سوچ اور امید و رجاء کے فروغ کا پیغام ہیں۔ ان کہانیوں میں ایسے واقعات کو افسانوی رنگ میں پیش کیا گیا ہے جو روزمرہ زندگی میں

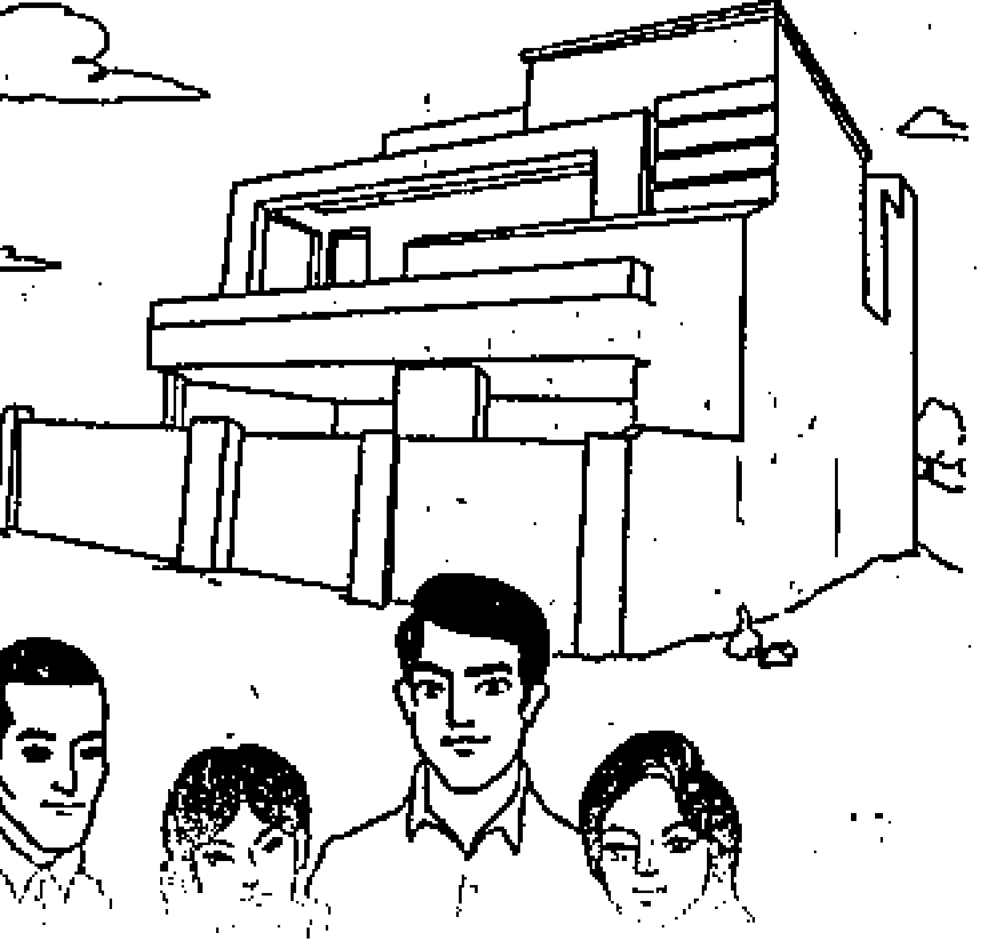
عام لوگوں کو پیش آتے ہیں۔ یہ واقعات خود ان لوگوں بلکہ ان کے ارد گرد بسنے والوں کی زندگیوں میں بڑی تبدیلیاں لانے کا محرک ثابت ہو سکتے ہیں۔ جواد اقبال جواد نے اِن واقعات کو بڑی عمدگی سے ادبی آہنگ میں قلم بند کیا ہے۔ امید ہے کہ کہانیوں کا یہ مجموعہ قارئین کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے میں کامیاب ہو گا اور مصنف اور ادارے دونوں کے مثبت اور تعمیری مقاصد کے حصول کا ذریعہ ثابت ہو گا۔

(۲)

مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن جو مارچ 2015 میں شائع ہوا تھا، قارئین کی پذیرائی کے باعث چھ سات ماہ کے قلیل عرصے میں ختم ہو گیا اور اب اس کا دوسرا ایڈیشن دو ہزار کی تعداد میں شائع کیا جا رہا ہے۔ امید ہے قارئین اسے بھی حسبِ سابق پذیرائی بخشیں گے۔

پروفیسر ڈاکٹر انعام الحق جاوید

مینیجنگ ڈائریکٹر



مختصر تعارف

سرِ دست کہانیوں کا یہ مجموعہ تکنیکی و ادبی تقاضوں کے مطابق کلی طور پر افسانہ نگاری نہیں، اگرچہ اس میں افسانہ کی کچھ خصوصیات ملحوظ رکھی گئی ہیں۔ دراصل یہ سبق آموز کہانیاں ہیں جن کا انداز بالعموم رجائیہ اور مثبت ہے۔ کہانیاں عام لوگوں کی زندگی کے واقعات کو بیان کرتی ہیں اور بیشتر کی بنیاد حقیقی واقعات ہی ہیں، اس لیے ان کا شمار محض فرضی کہانیوں میں نہیں کیا جا سکتا۔ چونکہ طوالت کے اعتبار سے بھی یہ زیادہ طویل نہیں، لہٰذا میں انہیں افسانچے کہنا مناسب سمجھوں گا۔

کہانیوں کے کردار اور واقعات عام زندگی سے لیے گئے ہیں۔ انجام و اختتام سوائے ایک عدد کہانی کے رجائیہ اور خوشگوار ہے۔ چونکہ یہ کہانیاں بنیادی طور پر دس بارہ سے سترہ اٹھارہ برس کے بچوں اور نوجوانوں کے لیے لکھی گئی ہیں اس لیے ٹریجک اینڈنگ زیادہ موزوں نہ تھی۔ منفی کردار بھی حالات کے تھپیڑے کھا کر سیدھی راہ پر آ جاتے ہیں۔ ہر کہانی میں کسی نہ کسی مقصد اور پیغام کو سامنے رکھا گیا ہے۔ مثبت انجام کو نباہنے کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ معاشرے میں پہلے سے ہی مایوسی اور انتشار کا دور دورہ ہے اور

نوجوان نسل اس سے بری طرح متاثر ہو رہی ہے اس لیے یہ ضروری ہے کہ نئی نسل کو مثبت اور امید افزا پیغام دیا جائے، مثبت اور اچھے کاموں کی طرف راغب کیا جائے اور ان کا حوصلہ بڑھایا جائے۔ خالص افسانوی آہنگ سے احراز کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس عمر میں عام درجے کے بچے اور نوجوان ادبی اسلوب کو پوری طرح سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں اور واقعاتی تسلسل اور کہانی کا رنگ انہیں لبھاتا ہے لہٰذا اسی اسلوب کو اپناتے ہوئے اپنا مقصد حاصل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کتاب دوستی، مطالعہ کا کلچر اور ادب کی طرف رغبت دلانا بھی اسی مقصد کا حصہ ہے۔ امید ہے یہ کہانیاں اس مقصد کے حصول میں کامیاب ہوں گی۔

جواد اقبال جواد

باگڑ بلی

امجد کے ہاتھ سلائی مشین کی ہتھی پر شل ہو چکے تھے مگر کام تھا کہ ختم ہونے کو نہ آتا تھا۔ " آرڈر پورے ہوں گے تو عیدی ملے گی پُتر و" استاد شادے کی آواز سلائی مشینوں کی آوازوں کو خاموش کرتے ہوئے بلند ہوئی۔ مگر اس کے بعد مشینیں دوبارہ اسی رفتار سے چلنے لگیں جیسے صبح سے چل رہی تھیں۔ ایسے میں وال کلاک بھی اپنی سنانے سے باز نہ رہا۔ اگر چہ اس کی آواز نقار خانے میں طوطی کی مانند تھی۔ مگر سب نے ایک بار اس کی طرف سر اٹھا کر دیکھا۔ رات کا ایک بج چکا تھا۔ امجد صبح سے اب تک چھٹا سوٹ سی رہا تھا۔ اسے اپنے گریبان کا ٹوٹا ہوا بٹن لگانے کی بھی فرصت نہ ملی تھی۔

امجد کی اماں اس کا انتظار کرتے کرتے سو چکی تھیں مگر جب ابا پانی پینے کے لیے تیسری بار اٹھے تو اماں کی آنکھ پھر سے کھل گئی اور اس کے بعد نیند کا آنا مشکل تھا۔ امجد کی چھوٹی بہن ماریہ کے کمرے کی لائیٹ جل رہی تھی۔ اماں نے دیکھا کہ ماریہ پڑھتے پڑھتے گاؤ تکیے سے ہی ٹیک لگائے سو گئی ہے۔ انھوں نے اس پر کمبل ڈالا اور لائیٹ بند کر کے باہر آ گئیں۔ اماں ابا

نے امجد کے بارے میں بات کی اور پھر ابا لمبی جمائی لیتے ہوئے دوبارہ چار پائی پر لیٹ گئے۔

"نہ جانے کب تک میرا امجد اسی طرح محنت کرتا رہے گا" ماں نے دل ہی دل میں کہا اور تسبیح اٹھا کر نیم دراز ہو گئیں۔

رمضان کا تیسرا عشرہ شروع ہوا اور امجد نے عید کی چھٹیاں ختم ہونے تک یونیورسٹی جانا معطل کر دیا۔ دکان پر کام ہی اتنا تھا۔ اس نے عید تک سخت چلہ کاٹنا تھا۔ ورنہ نہ تو گھر کا خرچ چل سکتا تھا اور نہ ہی اگلے سمسٹر کی فیس ادا ہو سکنی تھی۔ دونوں کام ہی ضروری تھے۔ ویسے تو یونیورسٹی کے بعد تین چار گھنٹے ہی کام کرنا ہوتا تھا مگر عید سے پہلے تو بہت راتیں جاگنا پڑتا تھا۔ وہ تو چاہتا تھا کہ پچھلے برس کی طرح کوئی بڑا کام کرے۔ اس نے پچھلی عید پر دو برس کی بچت سے ماریہ کو کانٹے لے کر دیے تھے۔ ابا نے جو کہا تھا کہ بہن کے کان خالی اچھے نہیں لگتے۔ مگر اس برس ابا کے علاج پر ہی بہت خرچہ ہو چکا تھا اور اوپر سے اگلے سمسٹر کی فیس بھی سر پر تھی۔ استاد شادے کو ہمیشہ اعتراض یہی ہوتا کہ "منڈے کے ہاتھ میں صفائی بہت ہے پر ٹیم پورا نہیں دیتا۔ اور پڑھے لکھے تھوڑے ہیں وہلے پھرنے کے لیے۔ یہ کتابیں حفظ کر کے عالم فاضل بن کر کیا کر لے گا" عید تک مشینیں پورے زور و شور سے چلتی رہیں، دھڑا دھڑ سوٹ سلتے رہے۔ سارے آرڈر پورے ہوئے۔



مگر عیدی پچھلے سال کی نسبت کچھ کم ہی ملی۔ پچھلی کچھ بچت کو ملا کر سمسٹر کی فیس پوری ہو رہی تھی۔ امجد کئی مرتبہ سوچتا کہ یونیورسٹی چھوڑ دے، بس پرائیویٹ بی اے ہی کر لے یا پھر کچھ بھی نہ کرے سوائے کمائی کرنے کے۔ گھر میں کچھ تو آسانی آئے۔ مگر اس کی اماں ان پڑھ ہونے کے باوجود اس کے لیے اچھی تعلیم ہی چاہتی تھیں۔ وہ کہتیں، "یہ سستی پڑھائی بھی سستے سوٹ جیسی ہی ہوتی ہے۔ صرف نام ہی ہوتا ہے، کام کچھ نہیں بنتا"۔ امجد خود بھی چاہتا تھا کہ پروفیشنل ڈگری مکمل کرے اور اچھے کیریئر کے قابل بن جائے۔

ڈھیروں ڈھیر سوٹ سینے کے باوجود عید پر اس کے پاس نئے کپڑے نہ تھے، مگر اسے اس بات کا اطمینان تھا کہ پانچواں سمسٹر آرام سے گزر جائے گا۔ چاند رات کو جب وہ جلد ہی سونے کے لیے اپنے کمرے کی طرف گیا تو اس کی باگڑ بلی ماریہ اس کے پیچھے آ گئی۔ "بھائی پچھلی عید پر تو کانٹے لے کر دیے تھے اس عید پر بہن کو خالی ہاتھ ہی رکھو گے"۔ امجد مسکرایا، "میری باگڑ بلی اس دفعہ میرا ہاتھ بہت تنگ ہے"۔ ماریہ منہ بسور کر بولی، "ہر عید پر قیمتی چیز نہیں دیتے۔ بھائی میرے ہاتھوں میں مہندی لگا دو، تم بہت اچھے پھول بناتے ہو"۔ امجد نے اس کے ہاتھ سے مہندی لیتے ہوئے کہا، "لاؤ تمہارے ہاتھ پیلے کر دوں"۔ ماریہ امجد کے سر پر ہلکی سی چپت رسید کرتے ہوئے، "پیلے نہیں، لال"۔ امجد مسکراتے ہوئے، "اچھا باگڑ بلی لال پیلی

ہونے کی کوئی ضرورت نہیں"۔ امجد نے اس کے ہاتھوں پر بڑی عمدگی سے مہندی لگا دی۔

عید کا دن تو بالکل خیریت سے گزرا مگر رات شروع ہوتے ہی ابا کو سانس لینے میں دشواری ہونے لگی۔ ڈاکٹر کی دی ہوئی دوا نے کوئی اثر نہ دکھایا۔ امجد ابا کو لے کر سرکاری ہسپتال چلا گیا۔ عید والے دن سرکاری ہسپتال میں کون ڈاکٹر ملتا۔ وہاں سے پرائیویٹ کلینک ہی جانا پڑا۔ ابا کی طبیعت سنبھلنے کو نہ آ رہی تھی۔ اب تو ابا کسی بات کا جواب بھی نہ دے رہے تھے۔ اس کے باوجود امجد نے گھر فون کر کے ماں اور بہن کو تسلی دی اور بتایا کہ اسے رات ابا کے ساتھ کلینک پر ہی رہنا پڑے گا۔ امجد اگرچہ بہت حوصلہ مند اور مستقل مزاج تھا مگر انیس بیس برس کی عمر شائد اتنے مسائل کے حل کے لیے ناکافی تھی۔ اسے کبھی اپنی بے بسی پر رونا آتا اور کبھی اپنی تنگدستی پر غصہ۔ انہی دو بلاؤں نے ہی تو ابا کو اس حالت تک پہنچایا تھا۔ " صحت صرف دواؤں سے واپس نہیں آتی۔ اس کے لیے اچھی خوراک بھی تو ہونی چاہیے۔ اچھی خوراک کا بندوبست ہو تو دوا کے پیسے نہیں رہتے اور دوا آئے تو پھر کچھ اور نہیں آتا"، امجد کا دماغ ہانڈی کی طرح کھول رہا تھا۔ ابا کو کچھ دیر تو مصنوعی سانس ہی دی جاتی رہی اور اس کے بعد کچھ امید نظر آئی۔ ابا نے

آنکھیں کھولیں اور ڈاکٹر نے بتایا کہ اب وہ خود سانس لینے کے قابل ہیں۔ اگلے دن بھی وہ کلینک میں ہی رہے اور تیسرے دن امجد انہیں لے کر گھر آیا۔ ایسے میں ہوا یہ کہ سمسٹر کی فیس یونیورسٹی کی بجائے کلینک کے اکاؤنٹ میں جمع ہو چکی تھی۔ امجد نے اس کا ذکر کسی سے نہ کیا بلکہ وہ دل ہی دل میں حتمی فیصلہ کر چکا تھا۔۔۔۔ یونیورسٹی کو خیر آباد کہنے کا فیصلہ۔۔۔۔ وہ جانتا تھا کہ بیمار باپ، بوڑھی ماں اور معصوم شرارتوں والی بہن کا فقط وہی سہارا ہے۔ اسی نے ان کی کفالت کرنی ہے۔ اب وہ چاہے یہ کام محنت مزدوری کر کے کرے یا کیریئر بنا کر۔ یہ وقت کیریئر بنانے کا نہیں، بس محنت کا تھا۔ اگلے سوموار کو نیا سمسٹر سٹارٹ ہو رہا تھا۔ امجد کے ماں باپ سب کچھ جانتے تھے مگر ان کے پاس خاموشی کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ ابا دل ہی دل میں اپنی بیماری، یہاں تک کہ اپنی زندگی کو کوس رہے تھے۔ اماں بھی شائد ایسا ہی سوچتی ہوں مگر ان کے منہ سے ناشکری یا کوسنے کا کوئی لفظ نہ نکلا۔ ماریہ کا رویہ جوں کا توں تھا۔ وہ بھائی سے خوش گپیاں بھی کرتی اور شرارت سے بھی باز نہ آتی۔ مگر نہ تو ماریہ نے امجد سے اس کی یونیورسٹی کے بارے میں پوچھا اور نہ ہی امجد نے ماریہ کے کالج کے بارے میں۔

سوموار کو امجد یونیورسٹی جانے کے ٹائم پر ہی گھر سے نکلا اور سیدھا

شادے استاد کی دکان پر چلا گیا۔ استاد اسے دیکھ کر بہت خوش ہوا اور بتایا کہ دس زنانہ سوٹ سلنے آئے ہیں۔ "بس کھڑکا دے۔ باقی نالائق تو اب عید کا بخارا اتار کر ہی آئیں گے"۔

اُدھر آج گھر میں خاموشی ہی خاموشی تھی۔ ماریہ صبح جلدی اٹھنے کے باوجود کالج کی بس سے لیٹ ہو چکی تھی اور اس پر اماں کی ڈانٹ بھی کھا چکی تھی۔ "میں پیدل ہی کالج چلی جاؤں گی، کوئی ٹانگیں ٹوٹی ہوئی ہیں میری"، ماریہ نے ابرو سکیڑتے ہوئے کہا۔ اماں نے کہا کہ وہ چھوڑ آتی ہیں مگر ماریہ نے انہیں یہ کہتے ہوئے روک دیا کہ وہ اکیلی جا سکتی ہے۔ ابا نے حسبِ معمول ماریہ کی ہی حمایت کی، "خواہ مخواہ کی پابندیاں نہ لگایا کرو بچی پر۔ وہ سمجھدار بھی ہے اور ہوشیار بھی" ماں بس خاموش ہو گئیں۔

امجد دوپہر تک دو سوٹ سی چکا تھا۔ تیسرے سوٹ کی کٹنگ جاری تھی کہ ماریہ برقع اوڑھے دکان پر آدھمکی۔ "او باگڑ بلی تم کالج نہیں گئیں؟؟؟ یہاں کیوں آ گئی ہو؟" ماریہ نے امجد کو ڈانٹتے ہوئے کہا، "تمھیں کوئی خیال نہیں ابا کا۔ ابھی ہسپتال سے واپس لائی ہوں انہیں، گھر چلو"۔ امجد سب کچھ چھوڑ کر بہن کے ساتھ گھر چل پڑا۔ شادے استاد نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا، "او کوئی نہیں پتر اللہ خیر کرے گا"

ابا اب کیسے ہیں" امجد نے انتہائی پریشانی کے عالم میں ماریہ سے

پوچھا۔ "ٹھیک ہیں" ماریہ نے اطمینان سے جواب دیا۔ "بھائی تم یونیورسٹی کیوں نہیں گئے؟"امجد نے کوئی جواب نہ دیا اور دونوں اکٹھے گھر میں داخل ہوئے۔

ابا کو صحن میں ٹہلتے دیکھ کر امجد کو قدرے اطمینان ہوا۔ "ابا آ۔۔۔۔۔ آپ ٹھیک ہیں ناں۔۔۔۔۔؟" اس نے گھبرائے ہوئے انداز میں پوچھا۔ ابا نے مسکرا کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا، " بالکل ٹھیک ہوں بیٹا" ابا نے ایک کاغذ جیب سے نکال کر امجد کی طرف بڑھایا، "بیٹا یہ دوائیاں ڈاکٹر نے لکھ کر دی ہیں، جاؤ لے آؤ۔ امجد نے کاغذ ابا کے ہاتھ سے لے کر اس پر نگاہ ڈالی۔ اس کے چہرے پر حیرت اور مسرت کے تاثرات نمایاں تھے۔ یہ ڈاکٹر کا نسخہ نہیں یونیورسٹی فیس کی رسید تھی۔ اس نے ابا کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ابا کے پیچھے اس کی باگڑ بلی اپنی معصومانہ شرارت کے ساتھ مسکرا رہی تھی۔ اس کی حیرت کی اس وقت کوئی حد نہ رہی جب اس نے یہ دیکھا کہ باگڑ بلی کے کان کانٹوں سے خالی تھے۔

بوڑھا برگد

گاؤں سے ذرا اِدھر شام کے دھندلکے میں نہایا ہوا تنہا بوڑھا برگد نہ جانے کن سوچوں اور یادوں میں گم ماضی کی علامت بنا ٹیلے پر کھڑا تھا۔ اسی بزرگ درخت کی نسبت سے اس گاؤں کا نام بوڑھ والی پڑ گیا تھا۔ دن کے وقت اس کا دل بہلانے اور اس کا ساتھ نباہنے والے پرندے بھی اسے خداحافظ کہہ کر اپنے آشیانوں کی جانب جا چکے تھے۔ فقط بڑے بڑے بدمست چمگادڑ تھے جو ابھی تک اس کی شاخوں سے الٹے لٹکے تھے۔ بوڑھا برگد ان خانماں برباودں کو کہتا بھی کیا۔ انہیں کوئی اور پناہ دیتا بھی کہاں ہے اور اس بزرگ نے تو ہر دور میں ہر کسی کو پناہ دی ہے، اپنی چھتر چھاؤں میں بٹھایا ہے۔ بوڑھا برگد کتنی بہاریں دیکھ چکا ہے یہ اسے خود بھی یاد نہیں۔ بالکل بابا شریف کی طرح جو کبھی تو بتاتا ہے کہ وہ جنگِ عظیم دوم سے پہلے انگریز فوج میں بھرتی ہوا اور پینسٹھ کی جنگ میں کھیم کرن فتح کر کے پاک فوج سے ریٹائر ہوا اور کبھی اسے یہ یاد آتا ہے کہ پاکستان بننے کے وقت وہ اسکول میں پڑھتا تھا۔ کبھی اسے پینسٹھ کی جنگ کے واقعات بھی بھول جاتے

ہیں اور کبھی وہ قیامِ پاکستان کے واقعات تاریخ کے حساب سے بالکل درست بتانا شروع کر دیتا ہے۔ برگد بابا شریف سے بھی زیادہ بوڑھا تھا۔ کیونکہ بابا شریف بچپن میں اسی کی چھاؤں میں کھیلا کرتا تھا، اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس کی شاخوں سے لٹکتا اور ہاں اس کے بڑے بھائی کا بازو بھی تو انہی شاخوں سے گر کر ٹوٹا تھا۔ بابا شریف کو وہ واقعہ بہت اچھے طریقے سے یاد تھا کیونکہ وہ بڑے بھائی سے بے حد محبت کرتا تھا۔ بابا شریف کا بڑا بیٹا اقبال جو برسوں پہلے پیسے کمانے ولایت چلا گیا تھا جب بھی بابا شریف کو خط لکھتا اس میں بوڑھے برگد کے متعلق ضرور پوچھتا۔ وہاں پردیس میں وہ جب کبھی اپنے گاؤں یا علاقے کے دوستوں سے ملتا برگد کے سائے میں گزری دوپہروں، اس سے وابستہ نشیلی شاموں اور چمکیلی صبحوں کا ذکر شاملِ گفتگو ہوتا۔ مگر اب تو اقبال کو بھی یہاں آئے کئی سال بیت چکے تھے۔ پرانے وقتوں میں اسی درخت کے نیچے گاؤں کی پنچائتیں بھی لگا کرتی تھیں اور برگد اپنے بازوؤں کے نیچے ہوتا انصاف اور بے انصافیاں بڑے دل کے ساتھ دیکھتا۔ کبھی انصاف کی فتح کا جشن مناتا اور کبھی مظلوم پر مزید ظلم ہوتا دیکھ کر دل ہی دل میں آنسو بہاتا۔ عید کی عید جب بابا دین محمد گاؤں کی لڑکیوں کے لیے دو تین پینگھیں ڈال دیتا۔ وہ کہتا یہ پرایہ دھن یہاں جھولا جھولیں گی، خوشیاں منائیں گی تو خدا بہت خوش ہوگا کیونکہ عام طور پر ان


بوڑیو والی
1 کلومیٹر

چڑیوں کی خوشی کی کم ہی پرواہ کی جاتی ہے اور پھر بیٹیاں تو سانجھی ہوتی ہیں۔
سارے گاؤں کی لڑکیاں بابا دین محمد کی بیٹیاں تھیں۔ عید کے پورے دن یہاں مینا بازار لگا رہتا۔ پھر ذرا بعد گاؤں کا پرائمری اسکول بھی اسی کے زیرِ سایہ چلنے لگا۔ دھوپ اور ہلکی ہلکی پھوہار میں یہ بچوں پر اپنی چھتری تانے رکھتا۔ جب اسکول کی عمارت بن گئی اور بچے اپنے بستے لیے ادھر جانے لگے تو برگد ذرا بھی ناراض نہ ہوا۔ وہ انہیں اسکول کے بعد اپنی طرف بلا لیتا۔ چھٹی کے دن تو پورے گاؤں کے بچے اسی کے پاس رہتے۔ گویا یہ بچوں کی آیا تھی جس کی آغوش میں پناہ تھی، پیار تھا۔

وقت آگے بڑھا تو ضرورتیں، آسائشیں، سوچ غرض یہ کہ پورے کا پورا طرزِ زندگی بدل گیا۔ ایسا لگا جیسے ویڈیو کو تیزی سے فارورڈ کر دیا گیا ہو۔ کچے آنگنوں میں پختہ اینٹیں اور پتھر کے فرش پڑنے لگے اور کیاریوں میں ایک دو رنگوں کی بجائے طرح طرح کے گلاب کھلنے لگے۔ مگر ان گلابوں میں خوشبو نہ تھی۔

اب شائد نہ تو کسی کو کسی کی چھاؤں کی ضرورت تھی اور نہ ہی کسی کی سائبانی کی قدر۔ بابا شریف پہلے جب دیکھتا کہ کوئی شریر بچہ کوئی نقصان یا خطرناک شرارت کرنے لگا ہے یا کسی بے کار مشغلے میں لگا ہوا ہے تو وہ اسے اس سے روک دیتا، اس کی اصلاح کر دیتا۔ مگر اب بابا شریف اور اس جیسے

اور بابے ایسا نہ کرتے اور نہ ہی انہیں کرنے دیا جاتا۔اب بچے بوڑھے برگد کی طرف نہ آتے۔ کچھ تو گلی کوچوں میں شرارتیں کرتے پھرتے یا کچھ کو ان کے والدین ٹی وی کی سکرین کے سامنے بٹھا دیتے۔ اکثر کو تو سکرین کے سامنے بٹھانے کی ضرورت بھی پیش نہ آتی۔ وہ خود ہی یوں پہروں بیٹھے رہتے۔اب بوڑھے برگد کی شاخوں پر بچے نہیں چمگادڑ لٹکتے اور بڑوں کو بھی اس طرف آنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔

اس سب کے باوجود برگد کو اس بات کا اطمینان تھا کہ وہ بے کار نہیں۔ فضا میں تازہ آکسیجن چھوڑتا ہے اور اس کے اردگرد اسی کی جڑوں سے کئی اور برگد بھی نکل آئے ہیں۔ یہ اس کی آل اولاد ہیں اور وہ اس جگہ تنہا نہیں۔ یہاں ٹیلے سے اسے پورے کا پورا گاؤں صاف دکھائی دیتا تھا۔اب کچے گھروں کی جگہ بڑے بڑے مکان تعمیر ہو چکے تھے۔اسے کچھ مکان تو خود سے بھی اونچے لگتے تھے۔گاؤں کے ساتھ ساتھ دوسرے درختوں کا جو سلسلہ ہوا کرتا تھا تمام کا تمام کٹ چکا تھا۔ایک دن ایک عجیب انکشاف ہوا۔ وہ جگہ جہاں برگد اور اس کی اولاد آباد تھی۔

چوہدری اختر کی ملکیت نکلی، حالانکہ یہ زمین کئی نسلوں سے دیہہ شاملات کا حصہ تھی۔مگر فیروز پٹواری کے لٹھے کی تحریر نہ جانے راتوں رات کیسے بدل گئی۔اب یہ زمین شاملات سے ترقی پا کر چوہدری اختر کی ملکیت

کا درجہ پا چکی تھی۔ چند لوگوں نے اعتراض کیا مگر چوہدری کی چوہدراہٹ کے سامنے کس کی چلنی تھی۔ انگلینڈ سے آئے پاؤنڈز پٹواریوں، وکیلوں، تھانیداروں اور غنڈوں کی ناز برداریوں کے لیے کافی تھے۔ ملکیت پکی ہونے کے بعد بات کھل کر سامنے آئی کہ چوہدری اختر نے یہاں عالیشان بنگلہ بنانا تھا۔ جگہ اونچی تھی۔ اس لیے یہاں تعمیر ہونے والی عمارت نے بلندی میں راجوں اور ملکوں کی کوٹھیوں کو بہت پیچھے چھوڑ جانا تھا۔ آخر وہ دن بھی آن پہنچا جب اس ٹیلے کو صاف کر کے تعمیر کے لیے تیار کیا جانا تھا۔ بابا شریف اس پیش رفت پر شائد اتنا چکنا چور ہو چکا تھا کہ اس نے چوہدری اختر کی جانب آنا بھی مناسب نہ سمجھا، فقط یہ کہلا بھیجا کہ چوہدری اس گاؤں سے اس کا نام اور پہچان نہ چھینے۔ جب برگد کا درخت ہی نہ رہا تو اس گاؤں کو بوڑھ والی کیسے کہا جائے گا۔ چوہدری اختر ویسے تو بہت اکھڑ مزاج تھا مگر بابا اس نے بابا شریف کے پیغام کو ذرا تحمل سے سنا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ اپنے فیصلے پر از سرِ نو غور کر رہا ہے مگر پھر بولا، " باباجی میرے لیے بہت محترم ہیں مگر بزرگ ہیں، انہیں نئے زمانے کی باتوں کا پتہ نہیں"۔ شائد اس نے دل میں یہی سوچا کہ اب بابا شریف اور بابے برگد دونوں کا زمانہ بیت چکا ہے۔ بس انہیں جلد ہی اس دنیا سے جانا ہے یا پھر چلے جانا چاہیے۔

چوہدری اختر کے مزدور ٹیلے پر پہنچ چکے تھے۔ بوڑھے برگد کے سامنے اس کی جوان اولاد کا قتلِ عام شروع کر دیا گیا۔ بھالے اور پھاوڑے ان کی جڑوں پر پڑتے تو یوں لگتا کہ ایک پوری تہذیب کو اکھاڑا جا رہا ہے۔ ماضی کے وہ سنہرے دن جو میٹھی یادوں کی صورت میں دلوں میں موجود تھے اب دھندلا رہے تھے۔ دوپہر کے بعد تک کافی سارے چھوٹے برگد کٹ چکے تھے۔ "اوو ڈی بوڑھ کو کب فارغ کرو گے؟" چوہدری اختر نے ایک مزدور سے پوچھا۔ "چوہدری جی آخر میں کھڑکائیں گے، بہت وڈی بلا ہے یہ"، اس مزدور نے جواب دیا۔

دور سے کسی گاڑی کے آنے کی آواز آئی اور چوہدری اختر نے چونک کر پیچھے دیکھا تو کچے راستے پر ایک کار آتی دکھائی دی۔ "کوئی ملنے والا ہوگا، گھر سے ہو کر اب ادھر آ رہا ہوگا"، اس نے ایک لمحے کے لیے سوچا، مگر یہ راستہ گاؤں کی بجائے سیدھا بڑی سڑک سے ادھر آتا تھا۔ کار ٹیلے سے ذرا پرے آ کر رکی۔ پینٹ شرٹ میں ملبوس ایک ادھیڑ عمر شخص کار سے نکلا اور ٹیلے کی طرف بڑھا۔ چوہدری اختر نے پہلے تو اسے نہ پہچانا مگر پھر پہچانتے ہوئے اس کی جانب بڑھا، "اوہ پہا اقبال ــــــ بسم اللہ، بسم اللہ" چوہدری اختر گرمجوشی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ بابا شریف کا بیٹا اقبال ایئر پورٹ سے سیدھا ادھر آ گیا تھا کیونکہ اس کے لیے گاؤں میں سب سے زیادہ خوبصورت چیز یہ

برگد کا درخت تھا جو کہ اس کے بچپن کا ساتھی تھا اور پیار کرنے والا بزرگ بھی۔

اقبال چوہدری اختر سے بغل گیر ہونے کے بعد اس کے ساتھ اوپر ٹیلے کی طرف بڑھا۔ "او اختر یا یہ کیا ہو رہا ہے؟؟؟؟۔۔۔۔۔۔" اِقبال ٹھٹھک کر رہ گیا۔ اقبال وہ شخص تھا جس نے اخترے کو چوہدری اختر بنایا تھا۔ یہی اسے انگلینڈ لے کر گیا تھا، اسے اپنے ساتھ رکھ کر روزگار کے قابل بنایا تھا۔

"اوئے رک جاؤ"۔ چوہدری اختر نے زمین کی طرف دیکھتے ہوئے مزدوروں سے کہا اور مزدوروں نے ہاتھ روک دیے۔

"تم نے فون پر کہا تھا کہ تم بہت اچھی جگہ کوٹھی بنا رہے ہو۔۔۔۔۔۔ یہی اچھی جگہ ملی تھی تمہیں"۔ اقبال غصے میں بول رہا تھا اور اختر سر جھکائے اس کے سامنے کھڑا تھا۔ "اختر یا دولت تو میں نے بھی بہت کمائی ہے مگر اپنی اصل نہیں گنوائی۔ انسان کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو جائے اگر اس کی جڑیں اپنی زمین میں نہ رہیں تو وہ منہ کے بل زمین پر آ گرتا ہے"۔

مزدور اپنے ساز و سامان کے ساتھ بوڑھے برگد کے نیچے ذرا پرے ہو کر بیٹھ چکے تھے۔

"ہاں اگر اتنی دولت کما کر بھی تمہاری ہوس نہیں گئی تو شام میری طرف آنا، میں اپنے حصے کی سڑک والی زمین تمہارے حوالے کر دوں گا، وہاں اپنا محل بنا لینا" یہ کہہ کر اقبال پیچھے کی طرف مڑا۔

سرد مہری اور احسان فراموشی کی خاکستری میں احسان مندی کی چنگاری موجود تھی۔ چوہدری اختر دولت کے نشے میں بہت کچھ اور بہت ساروں کو بھول چکا تھا مگر اسے وہ وقت یاد تھا جب قرض واپس نہ کرنے کی وجہ سے گاؤں والوں نے اس کے باپ کا حقہ پانی بند کر دیا تھا اور اقبال اسے اپنے خرچے پر ولایت لے کر گیا تھا۔ کچھ عرصہ تک تو پہلا اقبال ہی اس کے گھر کا خرچہ بھیجتا رہا اور پھر اسی کی مدد سے اختر کچھ کمانے کے قابل ہوا اور اس کے بعد ترقی کرتا چلا گیا۔ آج اس کا محسن اس سے ناراض ہو کر پلٹ رہا تھا۔ اختر تیزی سے اقبال کا راستہ روک کر اس کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ بڑے دل اور بڑے بازوؤں والا بوڑھا برگد یہ منظر دیکھ کر اپنی اولاد کا قتل معاف کر چکا تھا۔ بوڑھ والی کا نام اور اس کی پہچان سلامت تھے۔ سنہری روایات اور اقدار کو بچا لیا گیا تھا۔

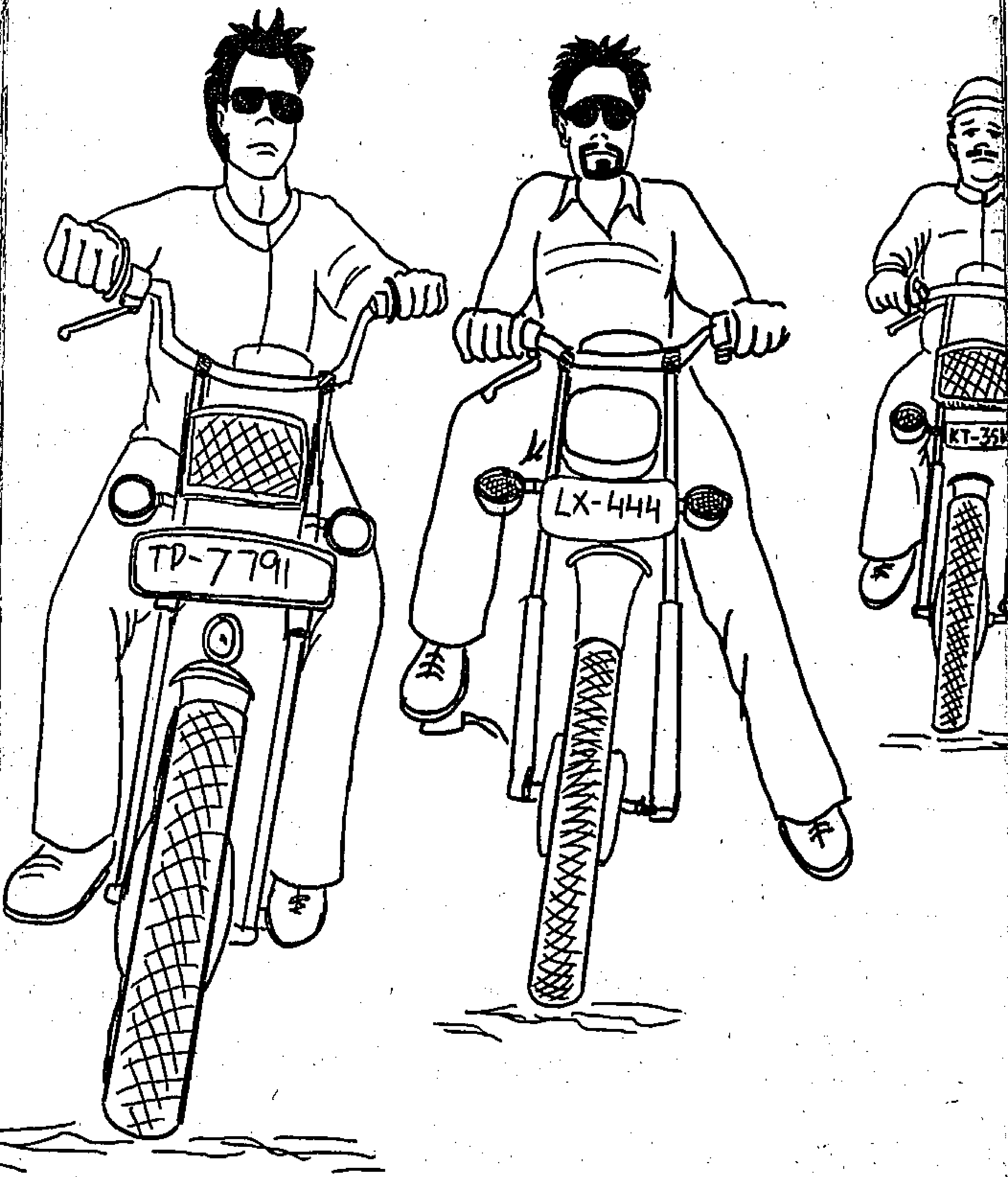
تیسری رات کا معرکہ

نعمان کا فیملی بیک گراؤنڈ ایسا نہ تھا کہ وہ مفلسی اور بے چارگی کے ہاتھوں مجبور ہو کر اخلاق اور قانون دونوں کی حد پار کرتا۔ کچھ ایڈوینچر کا جنون اور کچھ ایسے ذاتی اخراجات یا عیاشیاں تھیں جنہیں وہ اپنے جیب خرچ سے پورا نہیں کر سکتا تھا کیونکہ ان اخراجات کی تفصیل وہ اپنے ابا یا امی کو نہیں بتا سکتا تھا۔ کیونکہ ابا تو ہر چیز کا آڈٹ کرتے اور امی نرم طبیعت ہونے کے باوجود کفایت شعار تھیں۔

اسے دوست بھی ایسے میسر آئے تھے جن کے مزاج اور اطوار سبھی اس سے ملتے تھے۔ ظاہر ہے دوستی ہوتی ہی تب ہے جب ذہن و دل ملتے ہیں۔

شانی، بلا اور کامی اس کے سکول فیلوز تھے مگر منظور حسین عمر میں ان سے بڑا تھا اور ان سے پہلے ہی اسکول چھوڑ چکا تھا ان کا مانیٹر بلکہ سرغنہ تھا۔

یہ ساری ٹیم ڈکیتی اور رہزنی کی بہت ساری وارداتیں کر چکی تھی۔ منظور کئی بار جیل جانے کے باوجود راہِ راست پر نہ آیا تھا بلکہ حسبِ روایت جیل نے اسے اس کے اپنے راستے پر پکا کر دیا تھا۔ اسے کچھ با اثر لوگوں کی


TP-7791
LX-444

حمایت بھی حاصل تھی کیونکہ وہ ان کے جائز، ناجائز کام کرتا اور کراتا تھا۔لہٰذا اس کی سربراہی میں پولیس کا بھی کوئی ڈر نہیں تھا اور ڈر ہوتا بھی کیوں،

"جو ڈر گیا وہ مر گیا"۔نعمان کو ڈر تو نہیں لگتا تھا مگر شروع میں ان لوگوں پر ترس ضرور آتا جو اللہ رسول کا واسطہ دے کر التجائیں کرتے کہ ان کی عمر بھر کی کمائی نہ چھینی جائے۔مگر

"اس کام میں تو دل کو مضبوط رکھنا پڑتا ہے"

چار پانچ وارداتوں کے بعد اس کا دل واقعی مضبوط ہو گیا تھا۔اب وہ اس بات کی بھرپور صلاحیت رکھتا تھا کہ کسی ماں باپ کے سامنے ان کی بہو بیٹیوں کے ہاتھوں کی چوڑیاں اور کانوں سے بالیاں اتروالے، بچوں کے سامنے ان کے ماں باپ کو پیٹ ڈالے اور ماں باپ کے سامنے ان کے بچوں کو غلیظ گالیاں دے لے۔گن پوائنٹ پر موبائل فون اور نقدی چھیننا تو اب ان لوگوں کے ہاں وارم اپ کہلاتا تھا اور اصل مزہ تو پوری ڈکیتی میں ہی آتا تھا۔یہ چار یا پانچ لوگ کسی گھر میں داخل ہو کر اہلِ خانہ کو رسیوں سے باندھ دیتے اور ذرا سی مزاحمت پر انہیں پیٹ ڈالتے۔چونکہ یہ نعمان کی پارٹ ٹائم جاب تھی اس لیے شائد اس کے ماں باپ کو اس کی خبر نہ تھی اور شائد اگر کچھ تھی بھی تو روایتی طور پر کچھ لعن طعن کر کے اس کے اس کردار پر سے وہ آنکھیں موند لیتے۔

سمسٹر کی فائنل ٹرم کے امتحانات ہونے والے تھے اور ایسے میں نعمان کے خالہ زاد بھائی داؤد کی شادی بھی آن ٹپکی۔ داؤد اگرچہ اس سے چار پانچ برس بڑا تھا مگر دونوں میں بچپن سے دوستی تھی، لہٰذا اس کی شادی میں شرکت کی نعمان کو شدید خواہش تھی مگر اس سے یہی تقاضہ کیا جا رہا تھا کہ وہ گھر پر ہی رکے اور ابا کے حتمی فیصلے کے ساتھ اسے لاہور جانے کی بجائے گھر پہ ہی رکنا پڑا۔ نعمان نے اسے بھی غنیمت جانا کہ ان دنوں اسے اپنے دوستوں کے ساتھ ملکر خوب کارروائیوں کا موقع ملے گا۔ پہلی دو راتوں کو تو وارم اپ چلتا رہا۔

لاہور میں نعمان کے ابا اخبار پڑھتے ہوئے اس کی امی کو بتا رہے تھے کہ ان کے علاقے میں موبائل اور نقدی چھیننے کی وارداتیں بڑھ گئی ہیں اور گزشتہ رات مزاحمت پر ایک راہگیر کو گولی مار کر زخمی کر دیا گیا ہے۔

اِدھر تیسری رات تھی بڑے معرکے کی رات۔ آج پرانے پل سے آگے گاڑیاں روک کر لوٹنے کا منصوبہ تھا۔ چونکہ معرکہ بڑا تھا اس لیے منظور کسی بڑے نیٹ ورک سے چھ سات اور لوگ بھی لایا تھا۔ رات دس بجے کے بعد کارروائی شروع ہو گئی۔ پہلے تو حسبِ معمول اکا دکا گاڑیاں آ رہی تھیں اور بڑے سلیقے سے لٹ رہی تھیں پھر اچانک چار پانچ گاڑیاں اکٹھی آ گئیں اور سب روک لی گئیں۔

منظور نے ان لوگوں کو ایسی صورتحال سے نمٹنے کی بھی پوری ٹریننگ دے رکھی تھی۔ دو دو لوگ ایک ایک گاڑی کو لوٹ رہے تھے۔ اس ویرانے میں اتنی زیادہ گاڑیاں اور اتنے لوگ، مگر لوٹنے والوں کی دھمکیوں کے علاوہ کسی کی کوئی آواز نہ تھی۔ اچانک ایک گاڑی کی طرف کچھ شور ہوا۔ کسی لڑکی کی چیخ سنائی دی۔ شائد مزاحمت پر ڈاکو نے اُسے مارا یا اس نے خوف زدہ ہو کر چیخ ماری۔

پھر دست بدست لڑائی کی آواز آئی۔ نعمان اس طرف گیا اور پیچھے سے منظور کی آواز آئی، "جلدی کرو، فائر ماردو"۔ نعمان مدھم سی روشنی میں صرف اپنے ساتھی کو پہچان سکتا تھا کیونکہ تمام ڈاکوؤں نے سر پر بڑی بڑی چادریں لپیٹ رکھی تھیں۔ اس نے دیر نہ کی اور منظور کے آرڈر پر پسٹل سے فائر کر دیا اور پیچھے کی طرف بھاگا۔ فائر کے بعد لڑکی کی چیخوں نے تو جیسے آسمان سر پر اٹھالیا۔ اب سب کو بھاگنا تھا۔

"ابا۔۔۔۔۔ابا۔۔۔۔۔میرے ابا کو بچالو" ۔ گولی کھا کر گرنے والا شخص بھی چیخ رہا تھا، "ڈاکو، ڈاکو"۔ نعمان کے ساتھی تین گاڑیاں لے کر آئے تھے اور تقریباً سبھی ان میں سوار ہو چکے تھے۔ مگر جیپ کے قریب آتے جب اس نے پیچھے آوازیں سنیں تو اس کے پاؤں لڑکھڑا گئے۔ منظور اسے

گاڑی میں سوار ہونے کو کہہ رہا تھا۔ "او شہزادے جلدی کر، رولہ پڑ گیا ہے" ۔نعمان چیختی ہوئی دونوں آوازوں کو پہچان چکا تھا۔ چیخنے والی لڑکی اس کی اپنی بہن تھی اور گولی اس کے اپنے باپ کو لگی تھی۔۔۔۔۔وہ لوگ لاہور سے واپس آرہے تھے۔

اس طرح بھی ہوسکتا ہے

رات آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ زیادہ سرد اور خاموش بھی ہوتی جا رہی تھی۔ ایک تو یہ جگہ گاؤں اور بڑی شاہراہ دونوں سے کافی دور تھی اور دوسرا یہاں جنگل کی وجہ سے شام کے بعد کوئی نہ ٹھہرتا تھا۔ کچھ تو جنگلی جانوروں کا خوف اور کچھ بھوت پریت کے قصے۔

سردیوں کی رات کے نو بجے۔۔۔۔۔ اس وقت تو گاؤں بھی خاموشی کی چادر اوڑھ لیتا تھا، یہاں ایسا کیوں نہ ہوتا۔

ایسے میں منیر اپنی سانس کی آواز بھی صاف سن سکتا تھا۔ اس نے اپنا موبائل بھی سائلنٹ کر دیا تھا تا کہ کسی قسم کا شور نہ ہو۔ وہ بڑے ٹیلے کے ساتھ کیکر کے تنے کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ جب کبھی جیب میں موبائل کی سکرین روشن ہوتی تو اسے پتہ چلتا کہ ابا اسے ہدایات دینے کے لیے فون کر رہا ہے۔

یہاں سڑک ٹیلے کے پاس سے ہو کر ندی کے ساتھ ساتھ دوسری طرف مڑتی تھی۔ اس کے علاوہ اس جگہ سڑک بہت ہی خستہ حال تھی۔ اس



لیے آنے جانے والی گاڑیوں کو بہت آہستہ ہونا پڑتا تھا۔ ان سب باتوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے منیر نے اس جگہ کا انتخاب کیا تھا۔

وہ اپنا کام سرانجام دینے کے لیے پوری طرح تیار تھا کیونکہ اس کا باپ، چوہدری اسلم، اسے دو دن سے اس کام کے لیے تیار کرتا رہا تھا۔ دو دن پہلے پڑی راجگان کے راجوں کی آپس میں لڑائی ہوئی تھی، دونوں گروپوں نے ایک دوسرے پر خوب چڑھائی کی اور بڑی بڑی دھمکیوں کا تبادلہ بھی ہوا۔ یہ موقع منیر کے باپ چوہدری اسلم کے لیے بہت ہی قیمتی تھا کیونکہ راجوں کے ساتھ اس کی خاندانی دشمنی چلی آتی تھی اور آج اس کے خاندانی دشمن آپس میں لڑ پڑے تھے اور یہ ایسا موقع تھا کہ وہ اپنے مقتول باپ کے خون کا بدلہ بڑی آسانی سے لے سکتا تھا۔

اس طرح اس پر تو الزام بھی نہیں آنا تھا کیونکہ راجے تو آپس میں لڑ رہے تھے۔ اسے اس بات کی خبر تھی کہ پڑی راجگان کے نمبردار راجہ دلاور کا بیٹا ڈاکٹر اقبال ہفتے کی رات گاؤں آتا ہے اور اسے آسانی سے نشانہ بنایا جا سکتا ہے۔ ویسے تو پڑی راجگان کے راجوں اور جاٹ پورے کے چوہدریوں نے پچھلی ایک ڈیڑھ صدی سے ایک دوسرے کے کئی لوگ مارے تھے لیکن پچاس سال پہلے بڑا واقعہ یہ ہوا تھا کہ راجہ دلاور کے باپ نے چوہدری اسلم کے باپ کو قتل کیا تھا جو اس وقت جاٹ پورہ کا نمبردار تھا۔ چوہدری اسلم اس

وقت بچہ تھا اور اکلوتا لڑکا تھا، خود قتل کا بدلہ نہ لے سکا اور اسے اپنی اگلی نسل کے لیے قرض چھوڑ دیا۔ اب اس کا بڑا بیٹا منیر بیس برس کا ہو چکا تھا اور دادا کے قتل کا بدلہ لینے کے قابل تھا۔ اس لیے ضروری تھا کہ وہ مرد ہونے کا ثبوت دے اور راجہ دلاور کے بیٹے ڈاکٹر اقبال پر اپنا ہاتھ صاف کر لے۔ شک تو سراسر راجوں کے اندر کی مخالف پارٹی پر ہی جانا تھا۔

منیر کے باپ نے اس کام میں برادری کے کسی اور فرد یہاں تک کہ اپنے کسی محافظ کو بھی شامل نہیں کیا تھا تا کہ راز فاش ہونے کا کوئی اندیشہ نہ رہے۔

وہ آج رات خود سنگم ہوٹل پہ پرانا سا کھیس لپیٹے ایک طرف اندھیرے میں بیٹھا تھا تا کہ اس کی شناخت نہ ہو سکے۔ اس نے سنگم ہوٹل کا انتخاب اس لیے کیا تھا کہ یہ جی ٹی روڈ پر ٹھیک اس جگہ موجود تھا جہاں سے گاؤں کی طرف جانے والی سڑک نکلتی تھی۔ اس سڑک پر واقع دیہات کو جانے والے لوگ بس کے انتظار میں یہاں رکتے تھے۔ چوہدری اسلم کو اقبال کے معمول کے بارے میں پوری معلومات تھیں کہ وہ یہاں چائے پی کر ہی گاؤں کی طرف جاتا تھا اور اسی کی اطلاع اس نے منیر کو دینی تھی۔

ایک گھنٹہ انتظار کے بعد چوہدری اسلم کی توقع کے مطابق ڈاکٹر اقبال وہاں آیا۔ ہوٹل کے مالک دستگیر سے گپ شپ کرتے ہوئے چائے کا آرڈر

دیا۔ چوہدری اسلم نے سردی کا بہانہ کرتے ہوئے منہ کھیس میں لپیٹ رکھا تھا اور وہ ڈاکٹر اقبال کے قدرے قریب ہو گیا۔ اس سے پہلے وہ کوڈ ورڈز میں فون پہ منیر کو اطلاع دے چکا تھا۔ آج چوہدری اسلم کا کلیجہ ٹھنڈا ہونا تھا اس نے اپنے باپ کے قاتل کا پوتا قتل کرا دینا تھا۔ اتنے میں ڈاکٹر اقبال کے فون پر کال آئی۔ ایک تو چوہدری اسلم کی پوری توجہ اس پر تھی اور دوسرا ڈاکٹر اقبال ہر معاملے کی طرح گفتگو میں بھی بہت واضح تھا۔

"یار میں گاؤں جا رہا ہوں۔۔۔۔۔ راستے میں ہوں۔۔۔۔۔ او نہیں یار۔۔۔۔۔ کل آجاؤں گا یرا۔۔۔ آج تم سنبھال لو۔۔۔۔۔ کتنے پیشنٹس آئے ہیں۔۔۔۔۔ اچھا یار میں واپس آ جاتا ہوں۔۔۔۔۔ اب تیرے لیے ویک انڈ بھی گھر سے دور گزرے گا"۔

فون پر بات کرتے ہوئے وہ گاڑی میں جا بیٹھا۔ ڈاکٹر اقبال کی گاڑی گاؤں کی طرف جانے کی بجائے واپس شہر کی طرف مڑ گئی اور چوہدری اسلم کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ اس نے منیر کو فون کر کے اس کی اطلاع دی اور گھر جانے کو کہا اور خود گاؤں کی طرف جانے والی آخری بس کا انتظار کرنے لگا۔ وہ کچھ زیادہ ہی احتیاط کر گیا تھا کہ اپنی جیپ بھی نہیں لایا تھا۔

ڈاکٹر اقبال کو فون پر اس کا جونیئر کسی ایمرجنسی کی وجہ سے شہر واپس بلا رہا تھا۔ کچھ ہی دور جانے کے بعد اسی دوست نے دوبارہ فون کیا اور بتایا کہ

وہ خود ہی صورتحال سنبھال لے گا۔

"تھینک یو یار! تو نے میرا ویک اینڈ بچا لیا"۔ فون بند کرتے ہی اس نے گاڑی واپس موڑی۔ اتنے میں اسے یہ بھی یاد آیا کہ وہ بل ادا کیے بغیر ہوٹل سے اٹھ آیا تھا۔ وہ بل ادا کرنے کے لیے ہوٹل پر رکا اور پھر آگے بڑھ گیا۔

گاؤں کی آخری بس تو ابھی نہ آئی تھی مگر چوہدری اسلم اور منیر کا شکار اب گاؤں کی طرف جا رہا تھا۔ چوہدری اسلم نے منیر کا نمبر ملایا۔ بیل مسلسل جا رہی تھی مگر فون اٹنڈ نہیں ہو رہا تھا۔

"او ایک تو یہ منڈا فون کی گھنٹی سنتا ہی نہیں" چوہدری اسلم نے بار ہا فون ملایا مگر بے حاصل۔

منیر شائد گھر پہنچ کر فون ایک طرف پھینک کر اپنے کاموں میں لگ گیا تھا۔ چوہدری اسلم تلملا رہا تھا اور اتنے میں گاؤں کی آخری بس بھی آن پہنچی۔ وہ اس میں سوار ہوا اور ایک سوا ایک گھنٹے بعد گھر پہنچا۔ منیر ابھی تک گھر نہیں آیا تھا۔ یہ چیز اس کے لیے بہت تشویش ناک تھی۔

"او کہیں میرے باپ کی طرح میرے بیٹے کو بھی کسی نے۔۔۔۔۔"

اس نے ایک لمحے کے لیے سوچا مگر خیال آیا کہ منیر کسی دوست کی طرف نہ چلا گیا ہو۔ وہ رات گئے دوستوں کے پاس بیٹھا رہتا تھا۔

منیر کی ماں نے شکایت کی کہ لوگوں کے بچوں کو مائیں بگاڑتی ہیں مگر منیر باپ کا بگڑا ہوا ہے۔ چوہدری اسلم نے منیر کے ایک دو دوستوں کو فون کیا۔ مگر معلوم ہوا کہ وہ ان کی طرف نہیں ہے۔ چوہدری اسلم اپنے ایک ملازم کے ساتھ جیپ لے کر منیر کی تلاش میں نکل پڑا۔

منیر کو جونہی ابا کی طرف سے گھر جانے کی ہدایت ملی تھی وہ تیزی سے موٹر سائیکل بھگاتا ہوا گاؤں کی طرف روانہ ہوا اور کچھ دور جا کر ہی تیز رفتاری کی وجہ سے اس کی موٹر سائیکل برے طریقے سے سلپ ہو گئی۔ اسے جب تک ہوش تھا اس نے اردگرد موبائل فون تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن وہ کہیں دور جا گرا تھا۔

اس کے بعد جب اسے ہوش آیا تو وہ ڈاکٹر اقبال کے کمرے میں تھا۔ اس کا شکار اس کے سامنے کھڑا تھا۔ ڈاکٹر اقبال نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا، "تم بالکل ٹھیک ہو، بس احتیاط کیا کرو، کس گاؤں سے ہو ـــــ اور کس کے بیٹے ہو؟"۔ منیر نے کچھ ڈرتے ہوئے اور کچھ اندر ہی اندر شرمندہ ہوتے ہوئے اپنا اور اپنے ابا کا نام بتایا۔ ڈاکٹر اقبال نے مسکراتے ہوئے کہا، "شکر ہے یار تم محفوظ ہو، ورنہ تمہارے ابا نے ہمیں نہیں چھوڑنا تھا۔ تم دودھ وودھ پیو اور یہ لو اپنے گھر فون کر کے اپنی خیریت کی اطلاع دو، تمہارے گھر والے پریشان ہو رہے ہوں گے"، یہ کہتے ہوئے ڈاکٹر

اقبال نے اپنا فون اس کے حوالے کر دیا۔ منیر نے ابا کا نمبر ڈائل کیا۔

چوہدری اسلم اِدھر اُدھر بڑی احتیاط سے دیکھتے ہوئے جیپ چلا رہا تھا تا کہ کہیں منیر کا کوئی نشان ملے۔ اسے راستے میں منیر کی گری ہوئی موٹر سائیکل مل گئی۔ یہاں سڑک پر کچھ خون بھی گرا ہوا تھا جو یقیناً منیر کا ہی تھا۔ یہ منظر اس کے لیے قیامت سے کم نہ تھا۔ شائد اس کا بیٹا دشمن پر حملہ کرتے ہوئے خود ہی دشمن کی گولی کا شکار ہو چکا تھا۔ اسے کسی نے یہیں کہیں پھینک دیا ہوگا۔ وہ تیزی سے ادھر اُدھر دوڑا مگر اسے کچھ نہ ملا۔ اس کے ملازم کو منیر کا موبائل بھی ایک طرف گرا ہوا مل گیا۔ اتنے میں چوہدری اسلم کے فون پر کال آئی، اس نے ہڑبڑاتے ہوئے کال وصول کی۔

فون کے دوسری طرف منیر تھا۔

منیر: ابا میں بالکل ٹھیک ہوں

چوہدری اسلم: (بات کاٹتے ہوئے) تو ہے کہاں؟؟

منیر: وہ ڈاکٹر اقبال صاحب۔۔۔۔۔

چوہدری اسلم: (دوبارہ بات کاٹتے ہوئے) ڈاکٹر اقبال۔۔۔۔۔کیا ہوا اس کا

منیر: ابا انھوں نے مجھے بچا لیا، ورنہ میں مر چکا ہوتا۔ میرا موٹر سائیکل سلپ ہو گیا تھا اور کافی چوٹ آئی ہے۔ مگر ڈاکٹر صاحب کو خدا سلامت

رکھے۔۔۔۔آپ مجھے لینے کے لیے ان کے گھر آ جائیں۔

چوہدری اسلم کی جان میں جان آئی مگر اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔اس نے منیر کو ڈاکٹر اقبال کو قتل کرنے کے لیے بھیجا تھا۔

کچھ دیر بعد چوہدری اسلم ڈاکٹر اقبال کے گیٹ پر تھا۔"اندر آ جائیں چاچا جی"ڈاکٹر اقبال نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔"منیر بالکل ٹھیک ہے" اس نے چوہدری اسلم کو تسلی دی۔اتنے میں ڈاکٹر اقبال کا باپ راجہ دلاور بھی ڈاکٹر اقبال کے کمرے میں منیر کے پاس آ چکا تھا اور منیر کا حوصلہ بڑھانے کے لیے گپ شپ کر رہا تھا۔اس نے چوہدری اسلم سے مصافحہ کیا اور اسے منیر کے بارے میں تسلی دی۔چوہدری اسلم نے پہلے تو منیر کو پیار کیا اور پھر ڈاکٹر اقبال سے لپٹ کر رونے لگا۔

" بھتیجے تم نے میرے بیٹے کو بچا لیا،تم نے ہم سب کو بچا لیا"۔

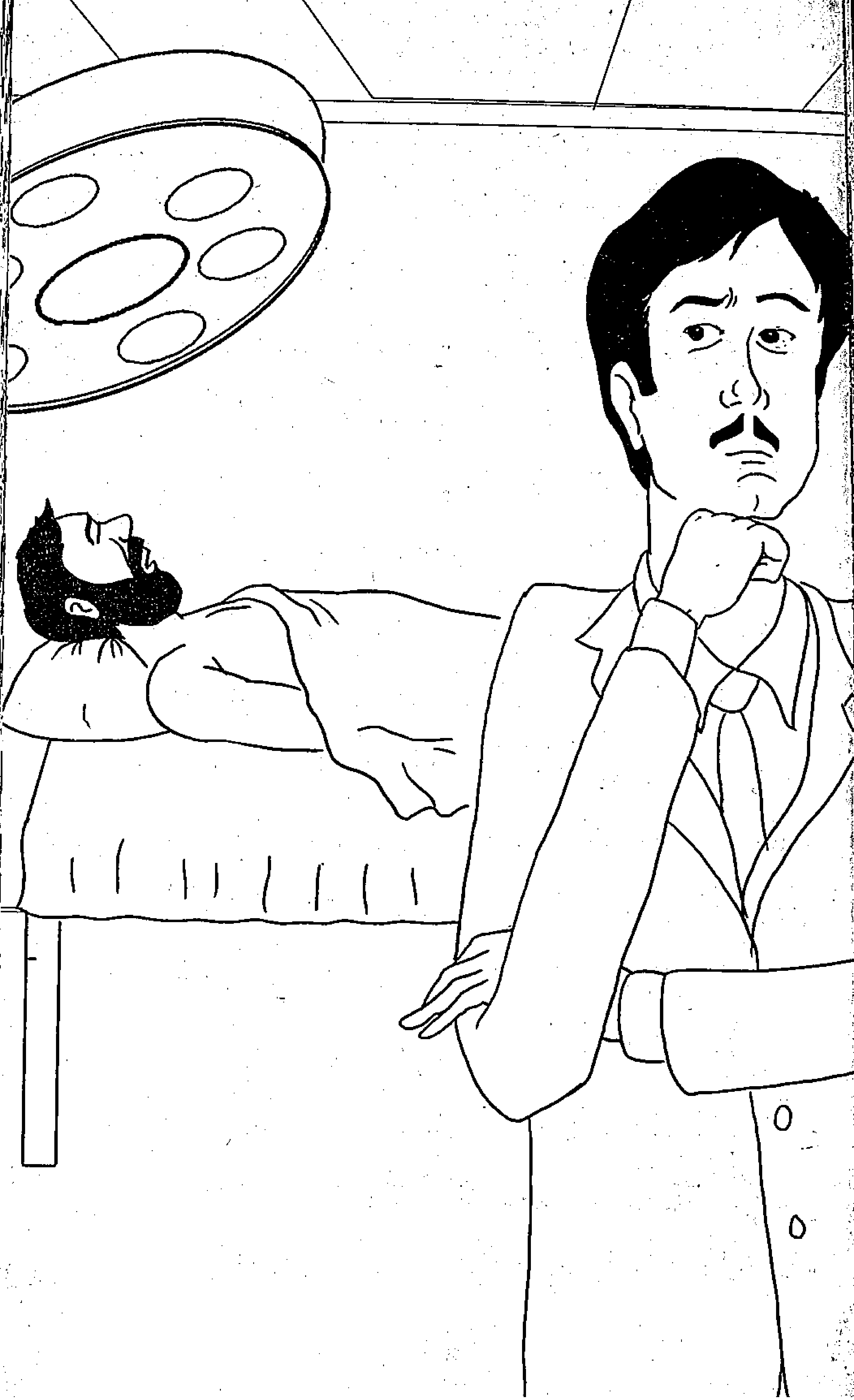
راجہ دلاور نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا، " او چوہدری صاحب یہ نیا زمانہ ہے،ہم بڈھوں کا پرانہ دور گزر چکا ہے،اب ان بچوں نے ایک دوسرے کا خیال رکھنا ہے،نہ کہ ہم جاہلوں کی طرح دشمنیاں پالنی ہیں۔

چوہدری اسلم اٹھ کر راجہ دلاور سے بغل گیر ہو گیا۔"راجہ صاحب آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں"۔ یہ بچے ایک دوسرے کے دشمن نہیں ہو

سکتے۔۔۔۔اور راجہ صاحب آپ بازی لے گئے ہیں۔آپ کا بیٹا بھی ہم پہ بازی لے گیا ہے۔اب ہمارے درمیان دشمنی نہیں دوستی چلے گی، بھائی چارہ ہوگا۔۔۔۔ڈیڑھ صدی کی دشمنی دوستی میں بدل چکی تھی۔

اللہ رکھا

گولی مریض کے سینے میں بالکل بائیں طرف لگی تھی مگر خوش قسمتی سے اس کا دل گولی کے راستے میں نہیں آیا تھا۔ اس کے باوجود اس کی جان بچانا ایک بڑا چیلنج تھا اور آئی سی یو میں ایسے مشکل چیلنجز کا سامنا کرنا ڈاکٹر عدیل کی روٹین بھی تھی اور اس کی شہرت بھی۔ یہاں تک کہ سینئرز بھی مشکل سرجریز اس کے حوالے کر کے سکھ کا سانس لیتے۔ گولی نکالنے کے بعد اس نے سوچا کہ مریض کے لواحقین کو تسلی دے آئے۔ باہر مریض کی بیوی اور دس گیارہ برس کا بیٹا موجود تھے۔ انھوں نے ڈاکٹر کی طرف یوں دیکھا جیسے ان کے سینوں میں بھی ایک ایک گولی پیوست ہو اور وہ اسے نکلوانے کے لیے بے قرار ہوں۔ ڈاکٹر عدیل نے مسکراتے ہوئے انہیں تسلی دی اور اس کے بعد پولیس انسپکٹر کو لے کر اندر چلا گیا۔ اس نے انسپکٹر کو بتایا کہ گولی تو نکل چکی ہے مگر ابھی مریض کی حالت خطرے سے باہر نہیں ہے۔ اگلے بارہ گھنٹے بہت اہم ہوں گے۔ انسپکٹر کے باہر جانے کے بعد اس نے مریض کے ذاتی کوائف جاننے کے لیے فائل پر نظر ڈالی۔ اس کے چہرے کی حالت بدلتی



گئی۔۔۔۔۔غصے اور نفرت کے ملے جلے تاثرات اس کے چہرے پر عیاں تھے۔اس نے اپنا ماسک اوپر کیا اور دوبارہ فائل کو دیکھنے لگا۔مریض ملک اللہ رکھا تھا، ملک اللہ رکھا ڈاکٹر عدیل کے باپ کا چچا زاد اور قاتل۔۔۔۔۔ زمین کی ملکیت کے تنازعے پر اس نے نہ صرف اس کے باپ کو قتل کیا تھا بلکہ عدیل جو کہ اس وقت صرف دو برس کا تھا کو بھی ختم کرنے کی منصوبہ بندی کی تھی تا کہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری۔ملک اللہ رکھا نہ صرف مالی طور پر مضبوط آدمی تھا بلکہ وہ جرائم پیشہ لوگوں کی سرپرستی بھی کرتا تھا۔قتل کرنا یا کرانا اور پھر اندھے قانون کی گرفت سے بچنا اس کے لیے کوئی مسئلہ نہ تھا۔عدیل کی ماں اپنے بیٹے کی جان بچانے کے لیے اپنے بھائی کے ساتھ گاؤں بلکہ علاقہ چھوڑ کر چار پانچ سو کلومیٹر دور ایک شہر کی نواحی بستی میں کرائے کے چھوٹے سے مکان میں چھپ کر زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئی۔عدیل کو ملک اللہ رکھا کے شر سے محفوظ رکھنے کے لیے نہ صرف اس کی ماں نے قربانی دی تھی بلکہ اس کے ماموں نے بھی گمنامی کی زندگی اختیار کی تھی۔

اپنا گھر اور دکان چھوڑ کر اپنے بیوی بچوں سمیت بہن کے ساتھ یہاں چلا آیا تھا۔انتہائی مشکل حالات کے باوجود دونوں بہن بھائی نے اپنی زندگی کو بہتر بنایا اور عدیل کو اس مقام پر پہنچایا۔ملک اللہ رکھا آج اسی بچے کے رحم و کرم پر تھا جسے اس نے دو برس کی عمر میں یتیم کر دیا تھا، پھر اسے قتل کرنے

کی کوشش بھی کی۔اسی کی دہشت نے اس بچے، اس کی ماں اور ماموں کو اپنا وطن، اپنا علاقہ چھوڑنے پر بھی مجبور کر دیا تھا، مگر ان سب کو اللہ نے ملک اللہ رکھا سے محفوظ رکھا۔

عدیل نے ایک بار سوچا کہ کیوں نہ اس ظالم شخص کو اس طرح ختم کر دے کہ طبی بنیادوں پر کوئی ثبوت نہ رہے اور کسی کو ثبوت حاصل کرنے کی ضرورت بھی کیوں ہوگی ۔ سینے میں گولی لگنے اور اتنا زیادہ خون بہہ جانے کے بعد کون بچتا ہے۔ یہ باتیں پولیس کے بھی سامنے تھیں اور شائد باہر بیٹھی پولیس ٹیم ملک اللہ رکھا کی موت کا انتظار کر رہی تھی ۔ اور تو اور پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی تو خود ڈاکٹر عدیل کے اپنے ہاتھ میں تھی ۔لیکن دوسرے ہی لمحے یہ خیال بھی ڈاکٹر عدیل کے ضمیر سے ٹکرایا کہ وہ تو ڈاکٹر ہے اور اس کا کام زندگیاں بچانا ہے۔ اس کے بعد وہ ایک اور مریض کو دیکھنے لگا لیکن ملک اللہ رکھا اور اس کا کیا ہوا ظلم اس کے دل و دماغ پر حاوی تھا۔

"ایسا شخص جو اس کے باپ کا قاتل ہے، اس کے باپ کے علاوہ کئی اور لوگوں کے قتل میں ملوث ہے، اندھے قانون کی گرفت سے آزاد ہے اسے ختم کرنا کوئی برائی تو نہیں بلکہ انسانیت کی بھلائی ہے۔ کچھ اور کرنے کی ضرورت نہیں۔صرف مرنے دینا ہی اس کی موت کے لیے کافی ہے۔"

عدیل کے جوان ہونے پر جب اس کی ماں اسے اپنی کہانی سناتی تو

کوشش کے باوجود اپنے آنسو نہ روک سکتی تھی۔ عدیل نے ایک دو بار ارادہ کیا کہ اپنے گاؤں کی خبر لے اور دیکھے کہ اس کے باپ کا قاتل کس حالت میں ہے مگر اس کی ماں نے اس سے عہد لیا ہوا تھا کہ وہ نہ اپنے گاؤں جانے کا کبھی ارادہ کرے گا اور نہ ہی اس کے متعلق کسی سے پوچھے گا۔

ملک اللہ رکھا کے خلاف تمام دلائل کے باوجود ڈاکٹر عدیل کے ضمیر کا یہی فیصلہ تھا کہ اسے وہی کرنا ہے جو ایک مسیحا کے ذمہ ہوتا ہے۔ اس نے ہر حال میں مریض کی زندگی بچانی ہے۔ اس کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ اس کی ماں اس کے آنے کا پوچھ رہی تھی کیونکہ وہ آج معمول سے زیادہ لیٹ ہو گیا تھا۔

"امی جی مریض کی حالت بہت خراب ہے، کچھ تسلی ہو تو میں آ جاتا ہوں"، اس نے ماں کو بتایا۔ دوبارہ مریض یعنی ملک اللہ رکھا کا معائنہ کیا اور یہ بات خوش آئند تھی کہ وہ تیزی سے بہتری کی طرف آ رہا تھا۔ ڈاکٹر عدیل نے چارج اگلی شفٹ والوں کے حوالے کیا اور گھر کی راہ لی۔

اگلے روز جب وہ ڈیوٹی پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ مریض ہوش میں آ چکا ہے۔ اس کی بیوی اور بیٹا اس کے سرہانے بیٹھے تھے۔ انھوں نے گرمجوشی سے احسان مندی کا اظہار کیا کیونکہ انہیں باقی عملے نے بتا رکھا تھا کہ اگر ملک اللہ رکھا کی جان بچی ہے تو وہ ڈاکٹر عدیل کی وجہ سے بچی ہے۔ ملک اللہ

رکھا نے بڑی عاجزی سے شکر گزار نظروں کے ساتھ اسے دیکھا۔ ڈاکٹر عدیل نے پیشہ ورانہ ذمہ داری پوری کرتے ہوئے بدل نخواستہ مسکرا کر اسے تسلی دینے کے لیے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور ملک اللہ رکھا نے اس کا ہاتھ چوم لیا۔ دو دن کے بعد وہ نہ صرف بالکل نارمل انداز میں بات کرنے کے قابل تھا بلکہ جب ڈاکٹر عدیل راؤنڈ پر آیا تو ملک اللہ رکھا بیڈ پر بیٹھا ہوا تھا۔ عدیل کی ایک عادت تھی کہ وہ مریضوں کے ساتھ گھل مل جاتا اور ان سے ان کے معمولات اور ان کی زندگی کے بارے میں بھی پوچھتا۔ وہ اپنی ماں سے کیے ہوئے وعدے کے مطابق اپنے گاؤں کے بارے میں تو نہیں پوچھ سکتا تھا مگر ملک اللہ رکھا تو ایک مریض تھا اور اس سے اس کی زندگی کے بارے میں دریافت کرنا وعدے کی خلاف ورزی تو نہ تھی۔ ڈاکٹر عدیل ملک اللہ رکھا سے بھی اس کے متعلق پوچھنے سے نہ رہ سکا۔

"ڈاکٹر صاحب آپ میرے مسیحا ہیں اس لیے آپ کو بتا رہا ہوں، جوانی ، بس، بڑے الٹے سیدھے کاموں میں گزری، ظلم بھی ہوئے۔ قدرت نے ان جرموں کی سزا بھی بڑی سخت دی۔ دوستوں سے زیادہ دشمن بنائے اور پھر۔۔۔۔۔ (وہ رو پڑا) دو جوان بیٹے قتل ہو گئے) میں کچھ نہ کر سکا۔۔۔۔۔ ڈاکٹر صاحب دشمن تگڑے ہیں۔۔۔۔۔ بیٹوں کے قتل کا بدلہ لینے کی کوشش کی تو یہ گولی میرے سینے میں اتر گئی۔۔۔۔۔ شکر ہے اس بچے

کی خاطر (اس نے اپنے کم سن بچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا) اللہ نے آپ کے ہاتھوں زندگی دی۔

ڈاکٹر دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا اور اپنے ضمیر کا شکر ادا کر رہا تھا کہ جس نے اسے انتقام کی آگ سے محفوظ رکھا تھا۔ ملک اللہ رکھا کا کم سن بیٹا یتیمی کے داغ سے بچ گیا تھا۔

"آپ کو اللہ نے رکھا چاچا"، ڈاکٹر عدیل نے کہا۔

ملک اللہ رکھا نے شکر بجا لاتے ہوئے اوپر کی طرف دیکھا۔

اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا، "اب رب سوہنے نے زندگی دی ہے۔۔۔۔سوچتا ہوں سچے دل سے توبہ کروں اور دشمنوں سے صلح کر کے اس بچے کی زندگی بناؤں۔۔۔۔دل میں یہ خیال بھی آتا ہے کہ جن پر میرے ہاتھ سے ظلم ہوا پتہ نہیں کب وہ بدلہ لینے کے لیے آ جائیں۔

ڈاکٹر عدیل نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا، "آپ سچے دل سے توبہ کریں تو ہو سکتا ہے اللہ ان لوگوں کے دل میں بھی رحم ڈال دے چاچا جی۔۔۔۔

"توبہ تو میرے دل سے نکل رہی ہے ڈاکٹر صاحب پر شائد میرے گناہ بہت بڑے ہیں"، ملک اللہ رکھا نے لمبی آہ بھری۔

"چاچا جی جس بچے کو آپ نے دو سال کی عمر میں یتیم کر کے اس کی ماں

اور ماموں سمیت جلا وطن کر دیا تھا، اسی نے آپ کی جان بچائی اور آج معاف بھی کر دیا ہے۔۔۔۔۔اللہ کرے باقی لوگ بھی معاف کر دیں"، یہ کہہ کر ڈاکٹر عدیل تیزی سے وارڈ سے باہر نکل گیا اور ملک اللہ رکھا جیسے حیرت، تذبذب اور ندامت کی وادیوں میں اتر گیا۔



پریت بھوت

اس کی دلگداز آواز اور دھیمہ لہجہ دل میں گھر کرنے کو کافی تھے۔ اس کے بولنے سے جیسے شہر یار کے ارد گرد کی فضا میں خوشبو بکھر رہی تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے اسے اپنے ارد گرد کی خبر ہی نہیں۔ ایسے میں اس کے جگر حارث نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا اور بولا ،"واپس آ جا میری جان، واپس آ جا۔۔۔۔ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں"۔ نعیم جوان تینوں دوستوں میں سب سے زیادہ سنجیدہ اور بزرگ طبیعت تھا شہر یار کی بجائے حارث کو ڈانٹنے لگا،

"یار حارث ایک تو وہ پاگل ہے اور دوسرا تو بھی اسے شہ دے رہا ہے کہ اس دلدل میں پھنستا چلا جائے"۔

حارث نے مسکراتے ہوئے جواب دیا، "یار مولوی صاحب میں اسے شہ کب دے رہا ہوں۔ اور اس عمر میں اتنا کچھ عشق نہیں کرے گا تو اسے بالغ ہونے کا سرٹیفکیٹ کون دے گا"۔

شہر یار نے ان دونوں کے جھگڑے سے دور جا کر موبائل پر کال جاری



رکھی اور اپنی پریت کی ڈوری کو اور بھی مضبوط کرنے لگا۔

"Ok Goodbye for the moment

اوہو پھر بات ہو گی"

وہ بات مکمل کر کے ان دونوں کے قریب آ گیا۔

نعیم جھٹ سے بولا، " لیلیٰ کتنے کا ایزی لوڈ کروا چکی ہے ہمارے لیلے سے"؟

شہر یار مسکرایا اور بولا، "یار ملا تو ابھی تک پچھلی صدی میں جی رہا ہے، میری جان دنیا چودہ سال آگے نکل آئی ہے۔ ایزی لوڈ کرواتی نہیں، بعض دفعہ مجھے بیلنس بھیج دیتی ہے۔ She is a fair lady"

حارث نے دوبارہ لب کشائی کی، "یار ملا یہی چیز تو مجھے بھی شک میں ڈال رہی ہے ورنہ پچھلے سال تو افتی بٹ لڑکی بن کر مجھے کالیں کرتا رہا ہے اور سالے نے کئی دفعہ مجھ سے ایزی لوڈ منگوایا۔ وہ تو مجھے نزدیک سے ہی پتہ چل گیا کہ یہ وہ کمینہ ہے۔۔۔۔ میں تو اسے کمینی ہی سمجھ رہا تھا۔۔۔۔"

تینوں قہقہہ مار کر ہنسے۔

نعیم: "چل تجھ سے تو یہ پریت کا بھوت اترا۔ مگر اب اسے چمٹ گیا ہے"

حارث: " پر یہ شہر یار والی تو شہر یار کو ایزی لوڈ بھیج دیتی ہے۔۔۔ جگر آگے بڑھ، کوئی ملاقات کا طے کر اور اتر جا عشق کے بھنور کے عین بیچ میں"

شہریار نے قدرے تفاخر کے ساتھ اپنی ٹھوڑی دائیں ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا، "جو مزہ بات میں ہے وہ ملاقات میں کہاں"

حارث نے طنزیہ انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، "پھر بچہ جی بات تک ہی رہو گے۔۔۔۔۔ جام اسی کا جس نے بڑھ کر اٹھالیا۔۔۔۔۔ منہ دیکھتے رہ جاؤ گے۔ اسے کہیں بلاؤ، اس سے ملو"۔

" کچھ کرنا پڑے گا جگر۔۔۔۔۔ بات کرتا ہوں اس سے"۔ شہریار نے کالر درست کرتے ہوئے کہا۔

نعیم: "نام کیا ہے اس کا"

شہریار: "نام میں کیا رکھا ہے"

نعیم: " میرا مطلب ہے بھئی اس کا کوئی نام، مقام بھی ہے یا بس پری زاد ہے وہ"

شہریار: "یار نعیم یہ فیس بک کی کوئی فیک آئیڈی نہیں ۔۔۔۔۔ جیتی جاگتی لڑکی ہے"۔

حارث: "یار ایک طرح سے مولوی کی بات بھی ٹھیک ہے۔ یہ نہ ہو کہ آڈیو تو بڑی پیاری ہو مگر ویڈیو بیڑا غرق کر دے۔ جن لڑکیوں کی آواز پیاری ہوتی ہے وہ زیادہ تر دیکھنے میں فارغ ہی ہوتی ہیں"

شہریار: "وہ ایسی نہیں ہو سکتی"

نعیم: "وہ کیوں ایسی نہیں ہوسکتی، تم نے دیکھی ہے کیا؟"

شہریار: "اب تو دیکھنی پڑے گی"

یہ کہہ کر شہریار اٹھا اور موٹر سائیکل کی طرف چل پڑا۔

حارث: "مولوی تیرے جذباتی خطاب نے سوئی ہوئی قوم کو جگا دیا ہے۔ اب یہ اسے دیکھ کر رہے گا اور ڈیٹ ویٹ بھی مارے گا"۔

شہریار ان سے رخصت ہو کر تیزی سے موٹر سائیکل چلاتا ہوا نکل گیا۔

شہریار اگرچہ شہر کے کھاتے پیتے کاروباری گھرانے سے تھا مگر اس کا باپ اس کی کڑی نگرانی کرتا۔ اسے مناسب جیب خرچ ملتا مگر اس میں عیاشی نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس کے باوجود باپ کا کنٹرول شائد انفارمیشن ٹیکنالوجی کے کمالات کا احاطہ نہ کرسکتا تھا۔ وہ اس کی موبائل فون کالز کا پورا حساب رکھتا، فیس بک کو بھی کچھ نا کچھ سمجھتا تھا مگر اب شائد ٹیکنالوجی نے جنریشن گیپ کو کافی بڑھا دیا تھا۔ وہ بہت کچھ جاننے کے باوجود بہت کچھ نہیں جانتا تھا۔ اس کی نگرانی کے باوجود شہریار کے رابطوں میں کچھ خاص فرق نہیں آیا تھا۔

اگلی صبح جب وہ کالج آیا تو اس کی آنکھوں سے صاف پتہ چل رہا تھا کہ وہ رات بھر سویا نہیں۔ نعیم نے اس سے آتے ہی پوچھا کہ، "موبائل پیکج یا سکائیپ؟"

شہریار نے آنکھیں ملتے ہوئے بتایا کہ رات کو بہت دیر اس کے ساتھ

سکائپ پہ بات ہوئی ہے اور ایسے میں اس نے "اس" کا نام بھی بتا دیا۔ اس کا نام سحرش تھا اور وہ شہر یار کو پورے طریقے سے اپنے سحر میں مبتلا کر چکی تھی۔ شہریار نے اسی کی خاطر سمارٹ فون بھی خرید لیا تھا اور اب تو ڈائریکٹ ویڈیو کال ہی ہوتی تھی۔ اب تو اس بات کا کوئی امکان نہ تھا کہ وہ کوئی فیک آئیڈی ہے یا وہ اپنی آواز جیسی خوبصورت نہیں۔ اس پر اس بات کا اطلاق ہر گز نہیں ہوتا تھا کہ، "خوبصورت آواز والی لڑکیاں خوبصورت نہیں ہوتیں"۔ شہریار کو حارث کی کھلی حمایت حاصل تھی۔ مگر نعیم اپنی ضد کا پکا تھا اور چاہتا تھا کہ شہریار سے پریت کا یہ بھوت اتر جائے۔ وہ تو اس بھوت کو دور کرنے کے لیے کسی پیر عامل کی طرح مصروفِ کار تھا اور اسی واسطے کبھی اسے مولوی کہا جاتا اور کبھی کیدو۔

شہریار سحرش سے ملاقات کی ضد کرتا مگر وہ کسی حیلے بہانے سے اسے ٹرخا دیتی۔ شائد وہ اس سے ملنے میں ہچکچا رہی تھی یا اسے واقعی کچھ مشکلات درپیش تھیں۔ بس وہ یہی کہتی، "بس تھوڑا سا صبر کرو، ملاقات صحیح ٹائم پہ کریں گے"۔ شہریار بس اس صحیح وقت کے انتظار میں تھا۔ آخر کار وہ صحیح وقت آن پہنچا۔ سحرش نے اسے ملنے کے لیے بلایا۔ ملاقات کی جگہ شہر میں نہیں بلکہ شہر کے مضافات میں ایک پرانے پارک میں تھی۔ شہریار بھی تو یہی چاہتا تھا کہ وہ اسے شہر سے دور ہی ملے تاکہ کسی طرح سے بھی خبر اس کے

والدین تک نہ پہنچے۔

ملاقات کے دن وہ موٹر سائیکل کی بجائے گاڑی پر روانہ ہوا۔ سحرش کی فرمائش تھی کہ وہ اس ملاقات کو بالکل سیکرٹ رکھے، اپنے قریبی دوستوں کو بھی نہ بتائے۔ مگر یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ وہ اس کامیابی کے بارے میں حارث اور نعیم کو نہ بتائے۔ اس نے انہیں بھی ساتھ لے لیا اور پارک سے کافی دور اتار دیا۔ وہ پارک میں پہنچا تو سحرش اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اس سے بڑی کامیابی اور اعزاز کی بات کیا ہوسکتی تھی کہ شہریار جس خوبصورت لڑکی پہ مرتا تھا وہ اس کے انتظار میں تھی۔

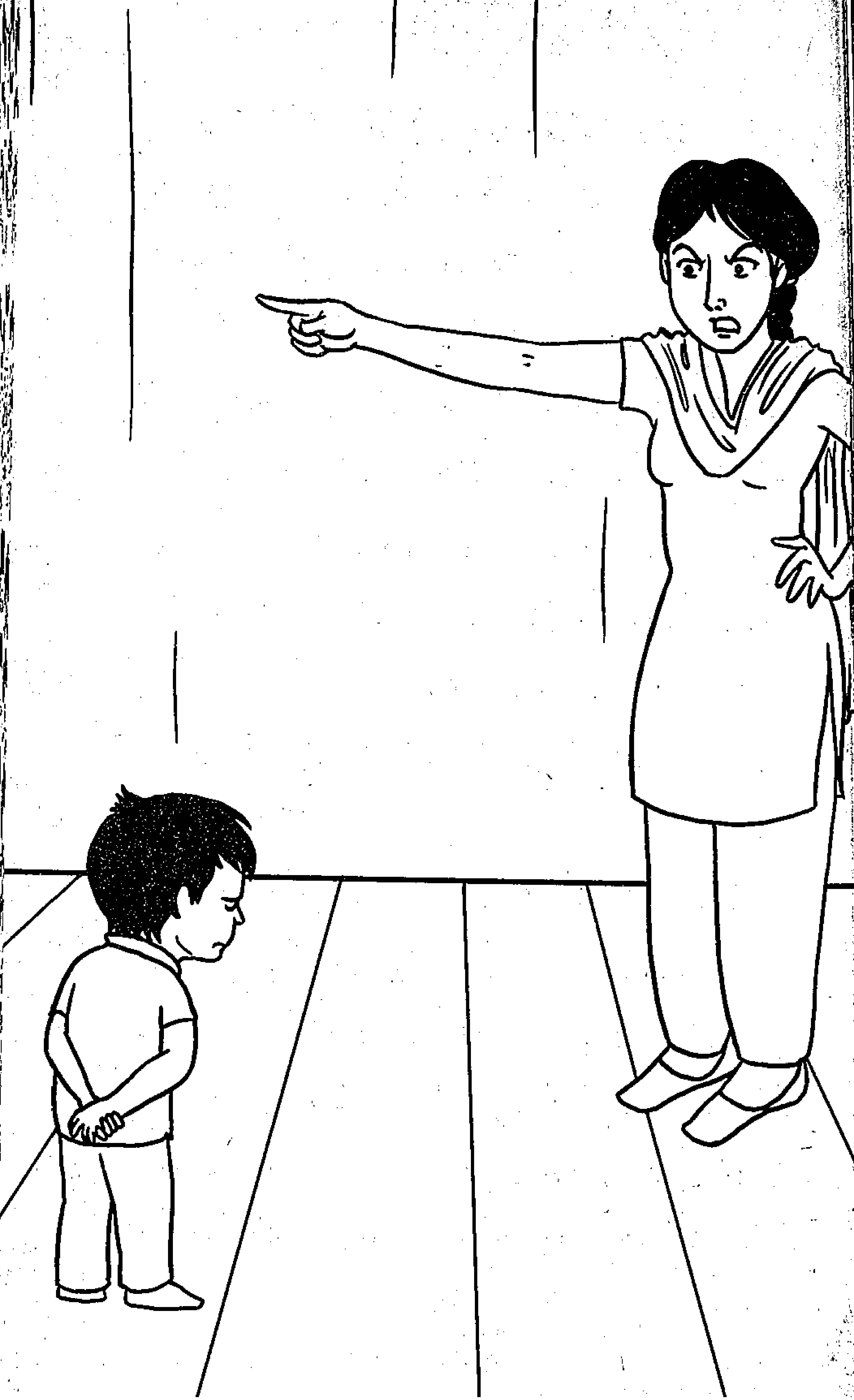
حارث اور نعیم نے آپس میں طے کیا کہ وہ تھوڑی دیر بعد دور سے ان لوگوں کو جا کر دیکھیں گے کہ واقعی سحرش شہریار کو ملنے آئی ہے یا نہیں۔

شہریار سحرش کے حسن سے اس قدر متاثر تھا اور اس کی پریت میں اتنا کھویا ہوا تھا کہ اسے اپنے اردگرد کی کچھ خبر نہ تھی۔ وہ چہل قدمی کرتے ہوئے درختوں اور جھاڑیوں کے بیچوں بیچ کافی دور جا چکے تھے۔ یہاں تو پارک بھی ختم ہو جاتا تھا اور اب باقاعدہ جنگل تھا۔ شہریار سحرش کے سحر میں گم تھا کہ اچانک پیچھے سے کسی نے اس کی گردن پر ہاتھ رکھا۔ اسے لگا جیسے حارث اور نعیم اس کے سر پر آن پہنچے ہیں اور یہ ہاتھ تو نعیم کا ہی ہوسکتا تھا۔ وہ چلایا، "یار مولوی!!!!"

"خبر دار ملنے کی کوشش کی تو سیدھے اوپر جاؤ گے" اب وہ لوہے کی ایک سلاخ کو اپنی پسلیوں کے ساتھ لگا ہوا محسوس کر سکتا تھا اور وہ سلاخ نہ تھی پستول کی نلی تھی اور اس کی گردن پر ہاتھ رکھنے والا نعیم نہیں بلکہ ایک بڑی بڑی مونچھوں والا اجنبی شخص تھا۔ وہ اکیلا نہ تھا۔ اس کے ساتھ دو اور لوگ بھی تھے۔ شہر یار نے گھبرا کر پہلے اس شخص کی طرف اور پھر سحرش کی طرف دیکھا۔ وہ بالکل بھی پریشان نہ تھی، بلکہ پہلے کی طرح مسکرا رہی تھی۔ بلکہ اس کی مسکراہٹ میں اب باقاعدہ ایک شرارت بھی تھی۔ اس نے مونچھوں والے شخص کے پیچھے کھڑے ایک اور شخص کی طرف دیکھا اور بولی، "میری ڈیوٹی ختم ہوگئی سر؟" اور وہ شخص اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔

سگے سوتیلے

سلیم اب اتنا بڑا ہو گیا تھا کہ اب وہ بہت کچھ محسوس کرنے کے ساتھ اسے سمجھنا بھی شروع ہو گیا تھا۔ اسے آج رات کیوں نیند نہ آ رہی تھی اس کی شائد اسے پورے طریقے سے سمجھ نہ تھی۔ اسے اپنی ماں کی یاد بھی ستا رہی تھی اور رہ رہ کر باپ پر غصہ بھی آ رہا تھا۔ کبھی وہ اپنے آپ کو کوستا اور کبھی اپنے باپ کو، لیکن اس کوسنے میں اس وقت تک عطیہ بیگم کا کوئی حصہ نہ تھا، کیونکہ اس کے نزدیک اصل قصور تو اس کے باپ کا تھا جس نے اس کی ماں کی موت کے کچھ عرصہ بعد ہی عطیہ بیگم سے شادی کر لی تھی۔ لیکن پھر یکایک اس کا ذہن اپنے باپ کی وکالت کرنے لگا۔ " آخر ابا کرتا بھی کیا، چاچے رشید کی طرح بیوی کے مرنے کے بعد اکیلا کیسے رہتا۔ چاچا رشید تو بیوی کے مرنے کے بعد رل ہی گیا ہے۔ دوسری شادی کرنا ابا کی مجبوری تھی، سو اس نے کر لی"۔ پھر اسے اپنے بھائی نوید پر بھی غصہ آتا۔ وہ اس سے بہت پیار کرتا تھا مگر وہ تھا تو عطیہ بیگم کا بیٹا اور کبھی کبھار ماں کی طرح ہی سلیم کا مخالف ہو جاتا تھا۔ وہ بہت چھوٹا تھا مگر اس کی ذرا سی بھی ناخوشگوار بات سلیم کو زیادہ ناخوشگوار لگتی تھی۔



پھر آس پاس کے لوگ بھی تو اسے یہی بتاتے تھے کہ نوید اس کا سوتیلا بھائی ہے اور سوتیلے تو سوتیلے ہوتے ہیں، سگے کب ہو سکتے ہیں۔ عطیہ بیگم دوسرے رشتہ داروں اور لوگوں کے ساتھ تو بہت اچھی تھی، اس کے باپ کی خدمت مدارت میں بھی کوئی کسر نہ چھوڑتی مگر شائد اس نے تمام لوگوں کے حصے کا غصہ سلیم کے کھاتے میں ڈال رکھا تھا۔ سلیم کی ڈانٹ ڈپٹ اور مار پیٹ اس کا معمول تھا اور اسے مارتی بھی ایسے کاموں پر تھی جن کے لیے ہلکی سی ڈانٹ ہی کافی تھی۔ سلیم کمرے میں اکیلا لیٹا ہوا تھا اور اس کے دل میں احساسِ محرومی خنجر کی طرح پیوست ہوا جا رہا تھا۔ "کاش ماں زندہ ہوتی اور اس وقت کمرے میں اس کے ساتھ ہوتی، اس سے جاگنے کا سبب پوچھتی، اس سے باتیں کرتی، اسے کچھ نا کچھ کھانے کو دیتی اور پھر اسے پیار کر کے سلاتی تو پھر اسے نیند کیوں نہ آتی۔

رات یونہی بے خوابی میں گزری۔ صبح عطیہ بیگم نے اس کے لیے ناشتہ تو بنایا مگر سلیم کو ذرا بھی بھوک نہ تھی اور نہ ہی اسے کچھ کھانے کے لیے کہا گیا جیسے مائیں بچوں کو زبردستی کچھ نا کچھ کھلانے کی کوشش کرتی ہیں۔ وہ خالی پیٹ اور بھاری بستے کے ساتھ اسکول گیا۔ بھوک تو اسے بڑے زور کی لگ رہی تھی لیکن کھانے کو صرف مار تھی اور وہ اس نے کھائی کیونکہ ماسٹر خادم حسین کا مشاہدہ یہی تھا کہ اس کا دھیان کہیں اور ہے اور وہ پڑھائی کی طرف توجہ

نہیں دے رہا۔ اسکول سے واپسی پر گھر میں داخل ہوتے ہی عطیہ بیگم نے اسے دکان سے سودا سلف لانے کو کہا اور دکان تک پہنچنے کے لیے اسے دوبارہ پہاڑی سے نیچے اترنا پڑتا تھا، اس لیے اس نے انکار کر دیا اور عطیہ بیگم غضبناک ہوگئی اور اسے برا بھلا کہنے لگی اور اس کی لعن طعن سلیم سے ہوتے ہوئے دو کوس کے فاصلے پر اس کی ماں کی قبر تک بھی پہنچ رہی تھی۔ "خود تو دوزخ جوگی مرگئی اور یہ نکھٹو میرے پلے پڑ گیا"

"خالہ مجھے جو مرضی کہہ لے، میری ماں کو کچھ نہ کہنا۔۔۔۔۔ وہ جنتی ہے۔۔۔۔ تیری طرح دوزخی نہیں"۔ سلیم اپنی ماں کے متعلق عطیہ بیگم کی زباں درازی برداشت نہ کر سکا۔ اُدھر عطیہ بیگم کے لیے اپنے آپ کو دوزخی سننا ناقابلِ برداشت تھا۔ اس نے ایک چانٹا زور سے سلیم کے منہ پر مارا۔ سلیم چیخا، "اللہ تمہیں دوزخ کی آگ میں ڈالے"، وہ چیختے ہوئے بولا، ایک اور چانٹا اس کی طرف گیا جسے اس نے اپنا سر جھکا کر اپنے بازو پر کھایا۔ عطیہ بیگم نے اسے بالوں سے پکڑ کر یوں جھنجھوڑا جیسے وہ اسے دیوار کے ساتھ پٹخ دے گی۔ سلیم نے پورے زور سے اپنے ناخن عطیہ بیگم کے اس بازو میں دبا دیے جس کی گرفت میں اس کے بال تھے۔ عطیہ بیگم چیختے ہوئے پیچھے ہٹی۔ ناخنوں کے نشان اس کی سفید کلائی پر واضح طور پر نظر آرہے تھے۔ شور کی آواز گھر کے باہر سے گزرتی ہوئی ماسی سکینہ نے سنی اور وہ گھر کے اندر آگئی۔

"کیا ہوا عطیہ پتر، کیوں شور مچا رہی ہو"۔ عطیہ بیگم اپنے بازو پر آستین درست کرتے ہوئے بولی، "بس ماسی، یہ بدذات جو میرے گھر والے نے میرے پلے ڈال دیا ہے، میں اسے جلا کر راکھ کر دوں گی"۔

سلیم جو ابھی تک ایک طرف خاموش کھڑا تھا پھٹ پڑا "تم مجھے جلاؤ گی، میں تمہارا بچہ جلا دوں گا"۔ اس نے جل کر کہا اور اس سے پہلے کہ عطیہ بیگم اس کی طرف بپھری ہوئی شیرنی کی طرح بڑھتی وہ بھاگ نکلا۔ وہ پہاڑی سے یوں نیچے اتر رہا تھا جیسے خوف زدہ بکری کا بچہ جس نے چکمہ دے کر اپنے شکاری کو غضبناک کر دیا ہو، اور اب وہ خوف کے مارے بھاگ رہا ہو۔ اس نے اپنے رشتہ داروں کی بجائے اپنے جگری دوست رفیق کے گھر پناہ لینے کو موزوں سمجھا۔ رات رفیق کی ماں نے جب کھانا اس کے سامنے رکھا تو وہ چاہتا تھا کہ آن کی آن میں سارا کھانا ہڑپ کر جائے اور اس نے ایسا ہی کیا، پچھلی رات سے بھوکا سلیم رفیق کے حصے کا بھی کھانا کھا گیا اور رفیق نے جان بوجھ کر اپنا ہاتھ آہستہ چلایا۔ کھانا کھا کر جب وہ بستر پر لیٹا تو عطیہ بیگم کی زیادتیاں اور اپنے باپ کی بے حسی۔۔۔۔۔۔ اسے سب کچھ بھول چکا تھا۔

اُدھر جب اس کا باپ گھر پہنچا تو عطیہ بیگم نے اسے سلیم کے بارے

میں اپنی طرف سے بھی بہت کچھ بتایا، گویا اصل خبر کے ساتھ بہت سارا تبصرہ بھی شامل تھا۔ وہ منہ سے کچھ نہ بولا۔ گھر سے نکلا اور سلیم کی تلاش میں تمام رشتہ داروں کی طرف ہو آیا۔ اسے شائد بن ماں کے بچے پر ترس بھی آ رہا تھا اور غصہ بھی۔ وہ اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک چکا تھا، رات گئے کسی نے بتایا کہ سلیم تو اس کے دوست رفیق کے ساتھ جا رہا تھا۔ وہ صبح سویرے رفیق کے گھر پہنچا اور پچھلی رات کو ملی خبر کو درست پایا۔ رفیق کی ماں نے اسے چائے پانی کا پوچھا اور سلیم کے حق میں وکالت کرتے ہوئے کہا، "بھائی جی بن ماں کا بچہ ہے، اس کا خیال رکھا کریں، سوتیلی ماں کچھ برا نہ بھی کرے اس کی باتیں سوتیلی لگتی ہیں۔۔۔ اسے کچھ نہ کہیے گا"۔ سلیم کے باپ نے یقین دلایا کہ وہ سلیم کو کچھ نہیں کہے گا اور اس نے سلیم کو کچھ نہ کہا، حالانکہ وہ تو یہ توقع کر رہا تھا کہ ابا گھر پہنچتے ہی بہت مارے گا اور عطیہ بیگم اس کا ہاتھ بٹائے گی۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ ابا خاموش ہی تھا اور اس کی خاموشی کے اندر موجود بے حسی کو سلیم باقاعدہ محسوس کر رہا تھا۔

دن بدن عطیہ بیگم کے رویے میں شدت بڑھ رہی تھی۔ یہاں تک کہ اب وہ نوید کو منع کرتی کہ وہ سلیم کے ساتھ نہ کھیلے۔ جب کبھی سلیم نوید کو اپنے پاس بلاتا یا اسے اٹھاتا تو عطیہ بیگم اسے دھتکار دیتی اور نوید کو سلیم سے دور رکھتی۔ سلیم سوچتا کہ اس طرح تو نوید بالکل ہی سوتیلا ہو جائے گا۔ عطیہ بیگم

کے اثر سے ابا تو پہلے ہی سوتیلا ہو چکا ہے اور اب شائد اس کے دل میں بھی سلیم کے لیے ناپسندیدگی بڑھ رہی تھی۔ وہ یونہی عطیہ بیگم کی سختی کو سہتا اور منہ سے کچھ نہ کہتا۔

ایک رات نیچے گاؤں سے عطیہ بیگم کے خالہ زاد بھائی کی وفات کی خبر آئی اور عطیہ بیگم اور ابا گھر سے نکل پڑے۔ عطیہ بیگم نے نوید کو اپنے کمرے میں سوتا چھوڑا مگر باہر سے تالہ لگا دیا، کیونکہ وہ سلیم کو نہ صرف نا قابلِ برداشت بلکہ نا قابلِ بھروسہ بھی سمجھنے لگی تھی۔ دونوں میاں بیوی پہاڑی سے نیچے اتر گئے۔ سلیم کو صرف ان کے جانے کی خبر تھی، اس کے بعد وہ گہری نیند سو گیا۔

عطیہ بیگم اور سلیم کا باپ ابھی فوتگی والے گھر پہ ہی تھے کہ کسی نے آ کر بتایا کہ اوپر پہاڑی پر آگ نظر آ رہی ہے، شائد آگ ان کے گھر والی جگہ پر ہی ہے۔ عطیہ بیگم کے منہ سے تو یہی نکلا، "ہائے اس کمبخت نے میرا بچہ جلا دیا ہوگا۔۔۔۔ ہائے"۔ سلیم کا باپ اسے تسلی تو دے رہا تھا مگر سب کچھ بے فائدہ تھا۔ وہ فوراً وہاں سے نکل پڑے اور کچھ رشتہ دار بھی ان کے ساتھ ہو لیے۔ آگ واقعی ان کے گھر والی جگہ ہی تھی۔ وہ تیزی سے اوپر کی طرف جا رہے تھے۔

عطیہ بیگم روتی جا رہی تھی اور سلیم کو بددعائیں دیے جا رہی تھی۔ "اس

نے یہی کہا تھا کہ وہ میرا بچہ جلا دے گا۔۔۔۔اس نے میرا گھر جلا دیا۔۔۔۔ہائے پتہ نہیں میرے بچے کا کیا حال ہوگا"۔ان لوگوں کا گھر بھی پہاڑی پر بالکل اکیلا تھا۔قریب کوئی ہمسائے بھی نہ تھے کہ آگ کو بجھا دیں۔ان لوگوں کو خود ہی جا کر آگ بجھانی تھی۔اب تو گاؤں کے بہت سے لوگ اوپر کی طرف جا رہے تھے اور ماسی سکینہ نے بھی عطیہ کے اس مؤقف کی تائید کر دی تھی کہ یہ آگ ضرور سلیم نے ہی لگائی ہوگی تاکہ عطیہ بیگم کا نوید جل جائے۔

آگ نے جب صحن میں پڑی سوکھی لکڑیوں کو اپنی لپیٹ میں لیا تو بہت شور اٹھا جس سے سلیم کی آنکھ کھل گئی۔اس نے باہر دیکھا تو ہر طرف آگ ہی آگ تھی اور وہ صحن سے گھر کی طرف بڑھ رہی تھی اور اس کے راستے میں پہلے عطیہ بیگم کا ہی کمرہ آتا تھا جہاں نوید سو رہا تھا۔سلیم تیزی سے باہر نکلا تاکہ نوید کو کمرے سے باہر نکال سکے،مگر وہاں تو مضبوط تالہ تھا۔عطیہ بیگم اپنے اس مقصد میں کامیاب تھی کہ سلیم نوید تک نہ پہنچ سکے۔سلیم نے کھڑکی توڑنے کی کوشش کی مگر وہاں لگے ہوئے لوہے کے سریے بہت مضبوط تھے اور آگ تھی کہ بس بڑھتی آ رہی تھی،یوں تو اب نومبر کا مہینہ تھا جو کہ پہاڑی علاقے میں خاصا سرد ہوتا ہے،مگر اس وقت یہاں جون جیسی گرمی تھی۔آگ کمرے کے دروازے تک پہنچ گئی۔سلیم کھڑکی والی طرف تھا۔ایک دفعہ اس

کے دل میں خیال آیا کہ جان بچا کر بھاگ جائے مگر اگلے ہی لمحے اسے ننھے نوید کی چیخوں نے روک لیا۔ خون کی کشش نے اس پیچھے کھینچا۔ آگ کی وجہ سے دروازہ اندر کی طرف گرا اور آگ سے پہلے سلیم اندر داخل ہو گیا۔ اس نے نوید کو اٹھالیا۔ "بھائی آگ۔۔۔۔۔بھائی۔۔۔۔۔میں جل جاؤں گا" خوف کے مارے سلیم سے لپٹے ہوئے نوید نے کہا۔ "نہیں نوید تمہیں کچھ نہیں ہوگا" سلیم نے اسے بھوسہ دیا اور اپنے ساتھ مزید زور سے لپٹا کر باہر کی طرف بھاگا۔ آگ دروازے سے اندر داخل ہو چکی تھی۔ مگر سلیم نے کچھ پرواہ نہ کی۔ وہ نوید کو اٹھائے آگ سے ہوتا ہوا ایک طرف کو بھاگا۔ آگ اس کے کپڑوں کو پکڑ چکی تھی، مگر نوید بالکل سلامت تھا۔ اس نے آگ سے دور جا کر نوید کو ایک طرف پھینکا اور خود زمین پر گر کر لوٹنے لگا۔

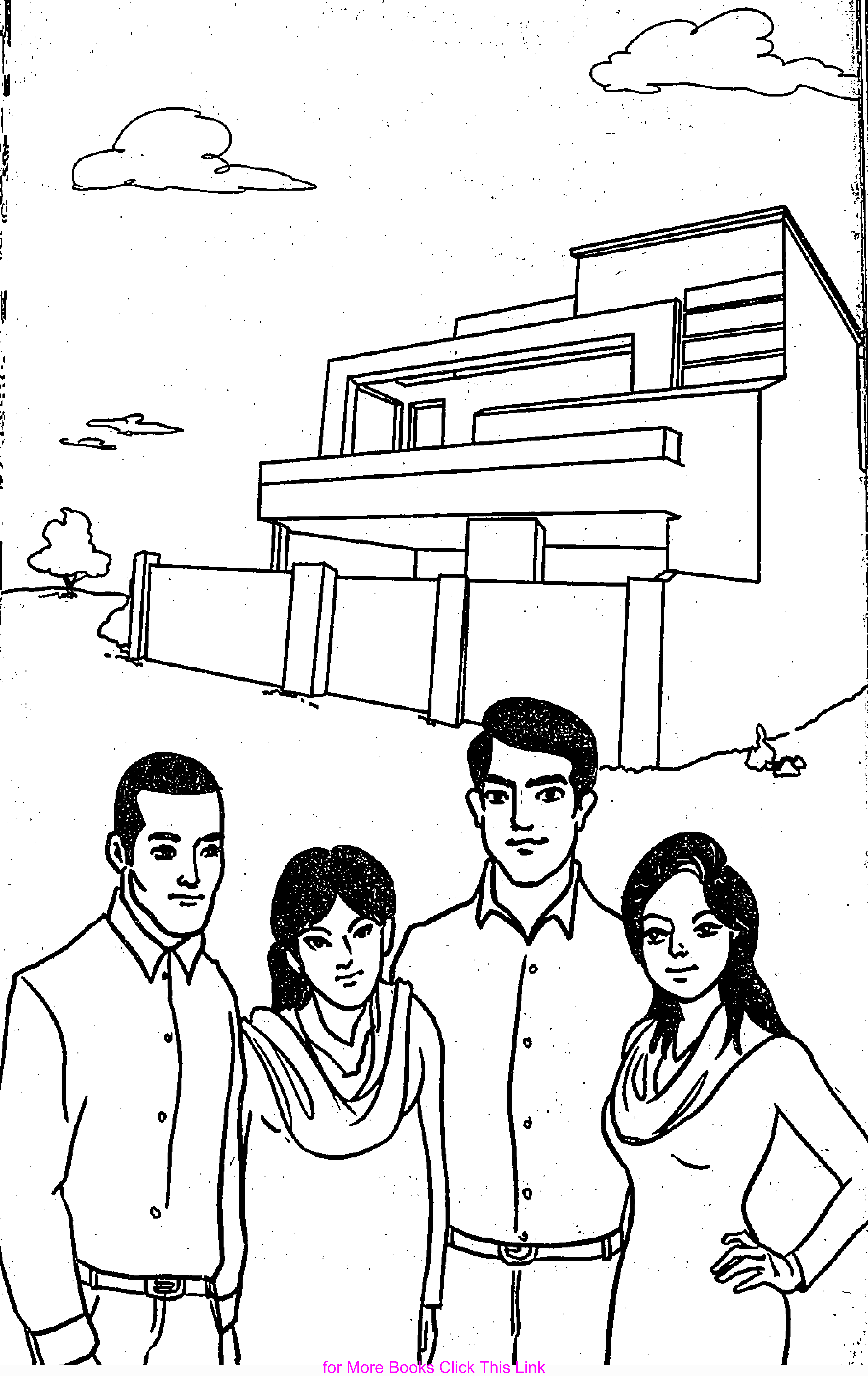
گاؤں والے وہاں پہنچ چکے تھے۔ عطیہ بیگم سب سے آگے تھی۔ "نوید۔۔۔۔نوید۔۔۔۔۔میرا بچہ۔۔۔۔۔" نوید ہانپتی کانپتی عطیہ بیگم کی طرف دوڑ گیا جس نے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ "امی ۔۔۔بھائی" نوید نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیا ہوا اس ذلیل، کمینے کو"، عطیہ بیگم نے جل بھن کر کہا۔ "امی میرا بھائی۔۔۔۔۔ میرے بھائی کو آگ۔۔۔۔۔" وہ عطیہ بیگم کو چھوڑ کر پیچھے کی طرف بھاگا۔ ایک شخص نے سلیم پر کمبل ڈال کر اسے آگ سے چھڑا لیا تھا اور باقی بہت سارے لوگ

آگ بجھانے میں مصروف تھے۔ سلیم کے جسم کے کافی حصے کو آگ نے جھلسا دیا تھا مگر خوش قسمتی سے وہ خطرے سے باہر تھا۔ نوید اس سے لپٹ کر رو رہا تھا۔ " بھائی تمہیں کیا ہو گیا ہے، آگ نے تمہیں جلا دیا ہے۔۔۔۔۔ امی۔۔۔۔۔ امی! بھائی نے مجھے آگ سے نکال لیا تھا مگر آگ نے اسے جلا دیا ہے۔۔۔۔۔" وہ روئے جا رہا تھا۔ سلیم کے باپ نے سلیم کو اٹھا کر چار پائی پر ڈال دیا اور کچھ لوگ دیسی طریقے سے اس کا علاج کرنے لگے، کوئی اسے ہسپتال پہنچانے کے لیے گاڑی لینے چلا گیا۔ اب عطیہ بیگم پر یہ عقدہ کھلا کہ سلیم نے نوید کو آگ میں جلایا نہیں، اسے آگ سے بچایا ہے۔ سلیم، بن ماں کا بچہ، اس کے سامنے زخمی پڑا تھا۔ نفرت اور ناپسندیدگی کی برف پگھل چکی تھی۔ شرمندگی اور دکھ سے وہ پھٹ پڑی۔ اس نے روتے ہوئے سلیم کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ میرے بچے میں نے تیرے ساتھ کیا کیا اور تو نے۔۔۔۔۔ اس نے سلیم کا ماتھا چوما تو سلیم بھی رونے لگا۔ ماں کی ٹھنڈک نے آگ کی جلن کو دور کر دیا تھا۔ اب کوئی سوتیلا نہ تھا۔ سب سگے تھے اور سب نے ایک دوسرے کا درد بانٹ لیا تھا۔



تقسیم

"اس گھر کا بٹوارا ہو کر رہے گا" چھوٹے بھائی، ندیم نے اعلان کیا۔ "جو بھی اس گھر کا مالک بنے گا میری لاش سے گزر کر بنے گا" بڑے بھائی نعیم نے اپنا فیصلہ سنایا۔ دو کنال پر مشتمل یہ گھر آج سمٹ کر شائد ایک مرلہ سے بھی کم ہو چکا تھا۔ اس وقت دونوں بھائی بمعہ اپنی بیگمات کے گھر میں موجود تھے۔ مگر خوش قسمتی سے دونوں جوڑوں کے بچے گھر میں نہیں تھے۔ دونوں کنبوں کی رہائش گھر کے دو الگ الگ پورشنز میں تھی۔ مگر مین گیٹ اور لان سانجھے تھے جیسا کہ کچھ خاندانوں میں دُکھ سُکھ سانجھے ہوا کرتے ہیں۔ چھوٹا بھائی اس بات پر مصر تھا کہ گھر کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے یا اسے فروخت کر کے رقم برابر تقسیم کر لی جائے۔ بڑا بھائی باپ کی اس نشانی کو تقسیم کر کے دولخت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اصولی طور پر اس گھر میں دو بہنوں، رخسانہ اور فرزانہ کا بھی حصہ تھا مگر وہ دوسری جائیداد سے اپنا حصہ لے کر رضا کارانہ طور پر اس مکان کی ملکیت سے دست بردار ہو چکی تھیں جیسا کہ اکثر بہنیں بھائیوں کی خاطر کیا کرتی ہیں۔



دونوں بھائیوں کا بچپن، لڑکپن اس گھر میں گزرا تھا اور اب دوسرے کے حق میں دست بردار ہو کر اس کو چھوڑنا دونوں کے بس میں نہ تھا، حالانکہ دونوں بھائی مالی طور پر اتنے مضبوط تھے کہ ایک کیا دو دو گھر بنا سکتے تھے۔ شادی شدہ یا شادی زدہ ہونے کے بعد دونوں بھائی کافی برسوں تک اس گھر میں اکٹھے رہے۔ مگر والدین یعنی بابو قیوم اور ان کی اہلیہ کے دنیا سے رخصت ہونے کے ساتھ ہی آپس کا احترام و محبت بھی جاتے رہے۔

اب جہاں دونوں بھائیوں کی اولادیں جوان ہو رہی تھیں وہاں باہمی اختلاف اور رنجشیں بھی پروان چڑھ رہے تھے۔ بچوں کی پسند اور ناپسند نے دونوں بھائیوں اور ان کی بیگمات کو ایک دوسرے کے مدِ مقابل لا کھڑا کیا تھا۔ آج سے پینتیس برس قبل یہ گھر جس پلاٹ پر تعمیر کیا گیا تھا اس کے حصول کے لیے بابو قیوم نے دس برس کورٹ کچہریوں کے دھکے کھائے تھے اور وکیلوں کو بہتیرے روپے کھلائے تھے۔ آج پینتیس برس بعد زمین کا یہ ٹکڑا اور اس پر تعمیر گھر شائد دوبارہ عدالتی کارروائی کا حصہ بننے جا رہے تھے۔ دونوں بھائیوں کی بیگمات بھی آپس میں سگی بہنیں تھیں۔ اسی لیے شائد بابو قیوم نے اپنے بعد اس گھر کی ملکیت کا فیصلہ نہ کیا تھا بلکہ اسے دونوں بھائیوں اور دونوں بہنوں یعنی ان کی بیویوں پر چھوڑ دیا تھا۔ آج دونوں بہنوں کا یہ حتمی فیصلہ تھا کہ وہ ایک نیام کی طرح ایک گھر میں اکٹھی نہیں رہ سکتیں۔ اس

تنازعے میں ایک دو بار دونوں بھائیوں کے ہاتھ ایک دوسرے کے گریبانوں تک بھی پہنچے۔ پھر دونوں بہنوں نے ایک دوسرے کو برا بھلا کہتے ہوئے اپنے اپنے خاوندوں کی مہاریں موڑ لیں۔

آج پھر دونوں بھائی آمنے سامنے تھے، ایک دوسرے پر اپنے اپنے احسانات بھی گنواتے جاتے اور ایک دوسرے کو برا بھلا بھی کہتے جاتے۔ آج کے بعد ان دونوں کا ایک گھر میں اکٹھے رہنا ناممکن تھا۔

سلطنت چاہے ایک گھر پر مشتمل ہو یا ایک پورے ملک پر بھائیوں کو ایک دوسرے کا دشمن بنا دیتی ہے۔ بھائی بھائیوں کو راستے سے ہٹانے کے لیے انہیں قید خانوں میں ڈلوا دیتے ہیں، ان کی آنکھوں میں سلائیاں پھرا کر حج پہ روانہ کر دیتے ہیں یا پھر برسرِ عام یا خفیہ طور پر مروا دیتے ہیں۔ صورتحال اب یہاں بھی کچھ ایسی ہی ہو چکی تھی۔

دونوں بھائی ایک دوسرے سے الگ ہو کر اپنے اپنے پورشن کی طرف چلے گئے۔ دونوں انتہائی غصے میں تھے اور شائد دل ہی دل میں فیصلہ کر چکے تھے۔ اب دونوں نے ایک دوسرے پر اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنا تھا یا عدالت سے رجوع کرنا تھا، یہ کسی کو معلوم نہ تھا۔

نعیم شروع سے ہی زیادہ غصیلہ اور ہر چیز پر اپنی ملکیت جتانے والا تھا۔ وہ یہی سوچ رہا تھا کہ اس گھر پر بھی صرف اس کا حق ہے۔ آخر کار اس

نے بہنوں کی شادیوں میں ماں باپ کی اعانت میں بہت کچھ خرچ کیا تھا اور اس وقت تو ندیم کا کوئی روزگار نہ تھا۔ بلکہ اس کے تعلیمی اخراجات میں بھی نعیم کی کمائی سے حصہ جاتا رہا تھا۔ چھوٹا بھائی بچپن، لڑکپن میں بڑا فرمان بردار طبیعت کا تھا اور زیادہ تر بڑے بھائی کی زیادتیوں پر خاموش ہو جاتا تھا۔ کھلونوں کی ملکیت پر جب کوئی جھگڑا ہوتا جیت نعیم کی ہوتی اور ندیم کچھ دیر رو کر خاموش ہو جاتا اور والدین کو شکایت بھی کم ہی کرتا۔ نعیم ندیم کے حصے کی آئیس کریم بھی چپکے سے کھا جاتا اور ندیم کو اس پر بھی کوئی زیادہ دکھ نہ ہوتا۔ مگر آج معاملہ کچھ اور تھا۔ تنازعہ کھلونوں یا آئیس کریم کا نہ تھا بلکہ گھر کی ملکیت پر تھا۔ بات صرف ندیم کی ذات تک محدود ہوتی تو شائد وہ بچپن کی طرح خاموش ہو جاتا مگر اب اس کے لیے سب سے اہم اس کی اولاد تھی اور اس سے بھی بڑھ کر اس اولاد کی ماں تھی۔

نعیم اپنے کمرے میں اکیلا لیٹا ہوا تھا۔ گہری سوچوں اور پرانی یادوں نے اس کے ذہن کو کمبل کی طرح لپیٹ رکھا تھا۔ اس کی بیوی کمرے میں داخل ہوئی مگر اس نے اسے سختی سے باہر جانے کو کہا اور وہ بدل نخواستہ باہر چلی گئی۔ باہر شام کی سرخی سیاہی میں بدل رہی تھی۔ اس وقت پرندے اپنے اپنے گھونسلوں تک پہنچ چکے ہوتے ہیں اور نہ پہنچنے والے تیزی سے پر مارتے ہوئے اپنے آشیانوں کی جانب رواں ہوتے ہیں۔ نعیم نے خاموشی کو

توڑنے کے لیے ٹی وی آن کرنے کے لیے ریموٹ اٹھایا مگر پھر کچھ سوچ کر میز پر ہی رکھ دیا۔

"جائیداد کے جھگڑے پر بڑے بھائی نے چھوٹے بھائی کو سفاکی سے قتل کر دیا"۔ "تایا نے دو بھتیجوں سمیت ان کے باپ کو موت کے گھاٹ اتار دیا"۔ " گھر کی ملکیت پر تنازعے نے بھائی کو بھائی سے محروم کر دیا"۔ اسی طرح کی خبریں خبرناموں پر چلتیں یا چل سکتی تھیں یا اخباروں میں چھپتی تھیں۔ نعیم کی آنکھیں بند تھیں اور پلکوں پر آنسو واضح تھے۔

آج کی یہ شام بچپن کی ان شاموں میں اترتی چلی جا رہی تھی جب بابو قیوم شام کو گھر لوٹتے اور ان کے دونوں بیٹے گھر کے باہر آ کر ان کا استقبال کرتے۔ دونوں بھائیوں کی کوشش ہوتی کہ وہ پھلوں کا تھیلہ یا مٹھائی کا ڈبہ ان کے ہاتھوں سے لے لیں مگر بابو قیوم کا یہ معمول تھا کہ وہ گھر آ کر کھانے پینے کی چیز پہلے اپنی بیٹیوں میں تقسیم کرتے اور اس کے بعد بیٹوں کی باری آتی۔ نعیم ندیم کی نسبت زیادہ چیز لیتا مگر ندیم جھگڑے کو زیادہ طوالت نہ دیتا۔ وہ شامیں بہت حسین ہوا کرتی تھیں۔ مگر آج کے جھگڑے میں ندیم نے نعیم کا کوئی لحاظ نہ کیا تھا۔ لیکن کیا سارا قصور ندیم کا تھا؟۔۔۔۔کیا ہر چیز پر نعیم کا ہی حق تھا؟۔۔۔۔شائد اسی طرح کے سوالات نعیم کے دماغ میں گھوم رہے تھے۔

مین گیٹ کی گھنٹی بجی اور کوئی گھر میں داخل ہوا۔ نعیم بستر پر نیم دراز ہی تھا کہ کسی نے اس کے کمرے کا دروازہ کھولا۔ سامنے اس کی دونوں بہنیں تھیں۔ شائد چھوٹے بھائی نے انہیں اس جھگڑے کی اطلاع دے دی تھی۔ احتراماً وہ سیدھی بڑے بھائی کے پاس ہی آئیں اور مکان کے مسئلے پر بات شروع کی۔ "بھائی جان ابو کے بعد آپ ہی ہمارے بڑے ہیں اور آپ نے ہی سب کو ایک بنا کر رکھنا ہے"، بڑی بہن فرزانہ نے کہا۔ "شائد بہنیں بھی اس سے گھر کی ملکیت میں حصہ لینے آئی ہوں"، نعیم سوچ رہا تھا، "پھر اس گھر کو فروخت کر کے رقم سب بہن بھائیوں میں تقسیم کر دینی چاہیے"۔

نعیم نہ چاہتے ہوئے بھی بہنوں کے ساتھ بات چیت کر رہا تھا۔ اس نے اس گھر سے اپنی جذباتی وابستگی کا بھی ذکر کیا۔ چھوٹی بہن بولی، "بھائی جان یہ گھر تبھی ہمارے کام کا ہے جب یہ ہمیں آپس میں تقسیم نہ کرے، بلکہ ایک بنائے۔ جب دلوں میں ہی پھوٹ پڑ جائے تو پھر اس کی مضبوط دیواروں کا کوئی فائدہ نہیں"۔ اس وقت تو پھوٹ نعیم کی زبان اور دل میں بھی پڑ چکی تھی۔ "اس نے بے رنگ سی ہنسی ہنستے ہوئے کہا، "فرزانہ! دیکھ ہماری چھوٹی بھی بڑی ہو گئی ہے، بڑی سیانی باتیں کر رہی ہے"۔ "چھوٹی" وہ بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی رخسانہ کو کہا کرتا تھا۔ اب اسے یقین ہو چکا تھا کہ بہنیں بھی ندیم کی طرح اس گھر کے بٹوارے پر تلی ہوئی ہیں۔ بابو قیوم

کی طرح وہ بھی فرزانہ اور رخسانہ کا بہت خیال رکھتا تھا۔ اب شائد اسے گھر فروخت کرکے رقم شرعی حصے کے مطابق بہن بھائیوں میں تقسیم کردے گا۔ دل ہی دل میں کیے جانے والے اس فیصلے نے نعیم کا دل بہت بوجھل کردیا تھا۔ آبائی گھر کی فروخت کا معاملہ اس کے لیے انتہائی تکلیف دہ تھا۔ وہ کسی بہانے سے بہنوں سے معذرت کرکے گھر سے نکل گیا۔ جب رات گئے گھر واپس آیا تو بہنیں اپنے اپنے گھر جا چکی تھیں اور اس کے بیوی بچے سو چکے تھے۔

اگلی صبح ندیم تو حسبِ معمول بہت جلدی کام پر چلا گیا مگر نعیم اپنے کمرے میں ہی نظر بند رہا۔ ندیم کے بعد اس کی بیوی اپنے بڑے بھائی کو ملنے یا اس سے شکایت لگانے گھر سے چلی گئی۔

ندیم دکان پر بیٹھا تھا مگر اس کا دل کام میں نہ لگتا تھا۔ بس سیلز مین مال بیچ رہے تھے اور خود ہی رقم وصول کرکے تجوری میں ڈال رہے تھے۔ وہ کل کے واقعے سے بہت زیادہ پریشان تھا۔ اس نے بڑے بھائی کے سامنے کبھی ایسا جھگڑا نہ کیا تھا اور نہ ہی بڑے بھائی نے اسے اتنی جلی کٹی سنائی تھیں۔ اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ وہ آبائی گھر چھوڑ دے گا۔ بڑا بھائی اور بہنیں ہی اس کی ملکیت میں حصے دار ہوں گے۔

شام کو ندیم بیوی بچوں سمیت دیر سے گھر لوٹا تو آگے کچھ اور ہی منظر

تھا۔نعیم کا سامان ایک ٹرک میں لادا جا رہا تھا اور نعیم یا اس کی بیوی بچوں میں سے کوئی موجود نہ تھا۔ٹرک ڈرائیور جانے والا تھا۔اس نے بتایا کہ بابو نعیم اپنا سامان ساتھ والی کالونی کے ایک گھر میں بھجوا رہے ہیں۔ایک ٹرک کا سامان جا چکا ہے۔

اصل میں یہ بات نعیم کے لیے نا قابلِ برداشت تھی کہ آبائی گھر اس کے سامنے فروخت ہو جائے۔اس نے یہی فیصلہ کیا کہ وہ رضا کارانہ طور پر گھر کی ملکیت سے دستبردار ہو جائے گا۔ندیم اور بہنیں آپس میں معاملہ طے کر لیں گے۔اس کے گھر چھوڑنے کی خبر بہنوں تک پہنچی تو وہ کرائے کا گھر ڈھونڈتی ہوئی نعیم کے پاس پہنچیں اور شکایت کی اس نے ایک دن پہلے ان کی پوری بات نہیں سنی تھی۔ وہ اس کے پاس اپنے حصے سے دست بردار ہونے آئی تھیں کہ بھائی آپس میں تقسیم نہ ہوں۔نعیم نے دونوں بہنوں کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھا۔"ہر چیز کی قربانی بہنیں ہی کیوں دیں"۔فرزانہ نے بھائی کے کندے سے سر لگاتے ہوئے کہا،"بھائی جان باقی جائیداد میں آپ نے ہمیں پورا پورا حصہ دیا ہے،ابا کا گھر تو آپ بھائیوں کے پاس ہی رہنا چاہیے"۔نعیم نے اس کا سر سہلاتے ہوئے کہا،"چلو اب گھر دیمو کے حوالے کر دیتے ہیں"۔

اب ندیم بھی یہاں پہنچ چکا تھا اور آتے ہی نعیم سے لپٹ کر یوں رونے

لگا جیسے وہ بچپن میں اپنی ضد پوری کرنے کے لیے بابو قیوم سے لپٹ کر رو دیا کرتا تھا۔ نعیم نے بھی اسے یوں چومنا شروع کر دیا جیسے بابو قیوم ندیم کو چوما کرتے تھے۔ "دیمو یہ مکان، جائیدادیں بھائیوں کو تقسیم کر دیتے ہیں لیکن میں تجھے خود سے جدا نہیں ہونے دوں گا"۔ ندیم نے اپنے دل کا فیصلہ بھائی اور بہنوں کو سنایا۔ اب سب کے سب حیرانی سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ کل تک جس مکان کی ملکیت کا مسئلہ تھا اب اس کا مالک بننے کے لیے کوئی تیار نہ تھا۔

ندیم اس بات پر مصر تھا کہ نعیم اپنا سامان گھر میں واپس لائے۔ اگر گھر چھوڑنا ہی ہے تو وہ چھوڑ دے گا۔ مگر نعیم نے اسے بتایا کہ وہ اپنے پلاٹ پر گھر بنائے گا اور تعمیر مکمل ہونے تک کرائے کے اس گھر میں رہے گا اور وہ ذرا برابر بھی اس سے ناراض نہیں۔ وہ الگ الگ گھروں میں رہیں گے مگر ایک دوسرے کے قریب رہیں گے۔ آبائی گھر واپس آ کر نعیم نے اپنی اور ندیم کی بیوی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، " آپس میں بہنیں بن کر رہو اور ہمیں بھائی بن کر ہی رہنے دو۔۔۔۔۔ خبردار کسی نے آئندہ لڑائی جھگڑے کی بات کی"۔ فرزانہ اور رخسانہ اپنے بھائیوں کو ایک ہوتا دیکھ کر بہت خوش تھیں۔ فرزانہ رخسانہ سے کہہ رہی تھی، "ہمارے ابا نے ہمیشہ ہمیں بھائیوں پر مقدم رکھا، ہم بھائیوں کو خود پر مقدم کیوں نہ رکھیں"۔ یہ رات اور یہ ساعت بہت

خوبصورت اور بہت مقدس تھی۔ محبت و خلوص نفرتوں اور کدورتوں پر فتح حاصل کر چکے تھے۔

اگلے دن دونوں بھائی پلاٹ پر انجینئر سمیت موجود تھے۔ " نقشہ تم بنواؤ گے " نعیم نے ندیم کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ " بھائی جان! سارا کام میں اپنی سپرویژن میں کرواؤں گا " ندیم نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور دونوں بھائی ایک ساتھ آگے بڑھ گئے۔



اُس کا غرور

نوکری کے اشتہار میں دیا گیا کالم خاصا مشکل تھا مگر سمیر کے خیال کے مطابق وہ ان تمام شرائط وضوابط پر پورا اترتا تھا۔ اہلیت وقابلیت کے کالمز کے علاوہ ایک نوٹ بھی شاملِ عبارت تھا کہ

"شارٹ لسٹ کیے گئے امیدواران کو کامیاب ڈیمو دینے کے بعد ہی اس اسامی کے لیے منتخب کیا جائے گا"۔

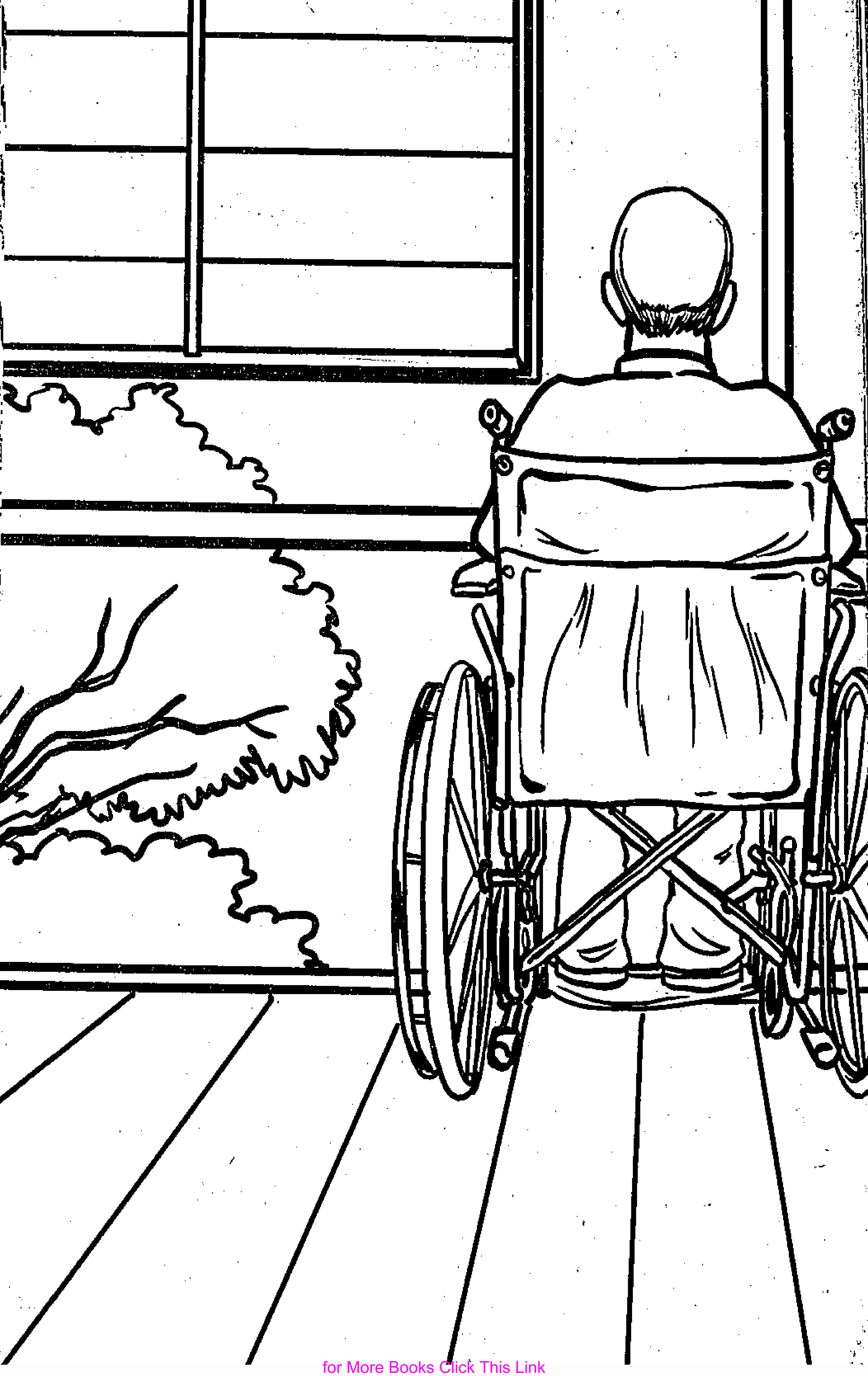
"ڈیمو بھی لے لو بھائی، ہمیں کسی ڈیمو ویمو کا خوف نہیں"، سمیر نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے ہوا میں جوش سے مکا لہراتے ہوئے کہا۔

ریسرچر اور کانٹینٹ رائیٹر کی اسامی تھی اور تنخواہ ومراعات بھی تسلی بخش تھیں۔ اسے پورا بھروسہ تھا کہ وہ یہ کام بخوبی کر سکے گا۔ سمیر نے ساری زندگی اپنی معذوری سے جنگ کی تھی اور زیادہ تر کامیاب ہی رہا تھا اور وہ اس بات پر فخر کرتا تھا، یہ اس کا مان بھی تھا اور اس کی کامیابی کا راز بھی۔ اس کے والدین، اساتذہ اور کلاس فیلوز سبھی اس سے خوش بھی تھے اور اس کی ذہانت ولیاقت کے معترف بھی۔

ہاں جب کبھی وہ کسی طور پسپائی کا شکار ہوتا تو اس وقت اپنے آپ کو کوستا، قدرت کا گلہ کرتے بھی نہ چونکتا۔ مگر جب کامیابی ملتی تو قدرت سے کیے پرانے گلے شکوے پر نادم اور معافی کا طلبگار ہوتا۔

انٹرویو اور ٹیسٹ کے دن وہ متعلقہ دفتر پہنچا۔ ٹیسٹ آن لائن تھا کیونکہ یہ کمپنی ملٹی نیشنل تھی، حالانکہ اس کا ذکر اشتہار میں نہ تھا اور یہ بات سمیر کے لیے زیادہ خوش کن تھی۔ ٹیسٹ کا ریزلٹ ایک گھنٹے کے بعد ہی دے دیا گیا اور سمیر کامیاب امیدواروں میں سرِ فہرست تھا۔ ٹیسٹ کے دوران ہی باقی امیدوار یہ بات بھی جان چکے تھے کہ وہ ٹاکنگ سافٹ ویئر جاز کی مدد سے ہی کمپیوٹر پر کام کر رہا تھا۔ اب ٹیسٹ میں اس کی نمایاں کامیابی پر وہ سب اسے داد بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے اور اس کی کامیابی پر خوش بھی تھے یہاں تک وہ لوگ بھی جو ٹیسٹ میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔ رزلٹ کے بعد انٹرویو کے لیے سب سے پہلے سمیر کو ہی آر ڈی کے دفتر میں بھیجا گیا۔ آر ڈی کے ساتھ دو اور سوٹڈ بوٹڈ حضرات بھی انٹرویو کمیٹی کے طور پر موجود تھے۔ وہ ٹیسٹ میں سمیر کی شاندار کارکردگی دیکھ چکے تھے اور اب اس کی تعلیمی اسناد کا جائزہ لے رہے تھے۔

"ڈسیبلیٹی سرٹیفکیٹ؟؟؟؟" ایک کمیٹی ممبر نے چونک کر پوچھا، "آپ کو کس قسم کی معذوری لاحق ہے؟"



سمیر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا، "معذوری تو کوئی نہیں لیکن طبی بنیادوں پر مجھے پارشلی بلائینڈ قرار دیا گیا ہے"۔

دوسرے کمیٹی ممبر نے سوال کیا، "تو آپ لکھتے پڑھتے کیسے ہیں"۔"

سن کے، میرا مطلب ہے میں آڈیو ایڈز کے ذریعے پڑھنے لکھنے کا کام کرتا ہوں" سمیر نے اطمینان سے جواب دیا۔

"یار آپ تو ایک عظیم انسان ہیں" پہلے کمیٹی ممبر نے یہ کہتے ہوئے کھڑے ہوکر اس سے مصافحہ کیا۔

"یار آپ کی تعظیم میں کھڑا ہونا تو بنتا ہے" دوسرے ممبر نے کھڑے ہو کر اس سے مصافحہ کیا اور اسے تھپکی دی۔

"گریٹ" آر ڈی نے بھی اپنا سکوت توڑا مگر کھڑے ہوکر سمیر کو تھپکی دینا اس کے لیے شائد ضروری نہ تھا حالانکہ سمیر اس کی توقع کر رہا تھا اور توقع پوری نہ ہونے کا اسے دکھ بھی ہوا۔ شائد اسے تھپکی نہ دینا آر ڈی کا غرور تھا اور ہاں اس کے چہرے کے تاثرات سے بھی غرور ملا رعب عیاں تھا۔

سمیر کو کہا گیا کہ وہ اگلے دن آئے اور ڈیمو کے طور پر ایک اسائنمنٹ پر کام کرے۔ اس کے بعد ہی اس کی تقرری کو حتمی شکل دی جائے گی۔

اگلی صبح وہ اسی عزم کے ساتھ آفس جانے کے لیے تیار ہوا جس عزم کے ساتھ وہ گزشتہ روز ٹیسٹ اور انٹرویو کے لیے گیا تھا۔ اس کے ذہن و دل

میں یہ سرخوشی سمائی ہوئی تھی کہ اسے میرٹ پر ایک بہت اچھی نوکری مل رہی ہے۔ اسے یہ خیال بھی آیا کہ جب وہ اپنے کالج کے دوستوں کے ساتھ کرکٹ نہیں کھیل سکتا تھا تو اس کا دل کُڑتا تھا اور قدرت سے گلہ بھی کرتا تھا۔ اسے اپنے ان گلوں شکووں پر شرمندگی ہو رہی تھی کہ پہلے کئی موقعوں کی طرح قدرت نے آج بھی اس قابل بنا دیا تھا کہ وہ آج بھی مکمل بینائی والے دوسرے ذہین لوگوں کو پیچھے چھوڑ چکا تھا اور وہ تشکر کے جذبات سے سرشار تھا۔ آفس پہنچنے پر اسے ایک روشن اور ہوادار کمرے میں بٹھا دیا گیا اور وہ اپنا لیپ ٹاپ سیٹ کر کے بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد اسے آر ڈی کے کمرے میں بلایا گیا۔ یہ توقع تو وہ نہیں کر رہا تھا کہ آر ڈی اسے اٹھ کر ملے گا مگر یہ بات اور بھی زیادہ تکلیف دہ تھی کہ آر ڈی اپنی کرسی سے ذرا بھی نہ ہلا۔ سمیر کو مجبوراً میز پر آگے کو جھک کر آر ڈی صاحب کو سلام کرنا پڑا۔ اسے اسائنمنٹ دی گئی اور اسے مکمل کرنے کے لیے اس کے پاس دو گھنٹے دیے گئے۔ اس نے پوری توجہ کے ساتھ کام شروع کیا۔ کچھ عجیب دشواری تھی اس ریسرچ میں بھی اور اس کے بعد اسی ریسرچ کی روشنی میں لکھے جانے والے آرٹیکلز میں بھی۔ "شائد میں ٹینس ہوں یا اس فرعون کے رعب میں ہوں" سمیر نے دل ہی دل میں سوچا۔ "نہیں نہیں، ایسا کچھ بھی نہیں۔ میں اسے کچھ کر کے دکھاؤں گا"۔ دو گھنٹے کے بعد اس نے آٹیکلز آر ڈی کو ای میل کر دیے۔ اب اسے اپنی

پرفارمینس کا رزلٹ ملنا تھا۔سمیر کو آر ڈی کے کمرے میں ایک بار پھر بلایا گیا۔اس نے سمیر کو بیٹھنے کے لیے بھی نہ کہا۔

" کیا تم نے پہلے کبھی ریسرچ کا کام نہیں کیا؟؟"، آر ڈی نے لیپ ٹاپ سے نظریں اوپر اٹھاتے ہوئے حقارت سے اس سے پوچھا۔

" جی بالکل سر"۔سمیر نے جواب دیا۔" اگر تم نے ایسی ہی ریسرچ کرنی ہے تو ہمیں تمہاری کوئی ضرورت نہیں اور تمہیں پروفیشنل آرٹیکل پلس کانٹینٹ رائیٹر کے طور پر اپوائینٹ کرنے کا سوچا تھا ہم نے۔تم جا سکتے ہو" آر ڈی نے ریوالونگ چیئر پر گھوم کر کھڑکی سے باہر دیکھنا شروع کر دیا۔سمیر کچھ کہے اور مزید کچھ سنے بغیر کمرے سے باہر آ گیا۔اس نے یہ غور بھی نہ کیا کہ آر ڈی نے اسے کمرے سے باہر جانے کو کہا ہے یا آفس سے۔اس کا سر غصے اور مایوسی کے ملے جلے جذبات سے گھوم رہا تھا۔اس نے اپنا لیپ ٹاپ لپیٹا اور ٹیکسی لے کر گھر آ گیا۔وہ بغیر کسی سے بات کیے اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔ ماں باپ کے پوچھنے پر اس نے بس اتنا کہا کہ " اس آرگنائزیشن کو میری اور نہ مجھے اس کی ضرورت ہے"۔وہ رات گئے اپنے آپ کو کوستا اور اپنے آپ سے گلے شکوے کرتا رہا۔اس بار اس نے قدرت سے گلے شکوے کا سلسلہ نہ کیا۔یہ کشمکش رات گئے تک جاری رہی اور پھر نہ جانے اسے کب نیند آئی اور صبح اس کی امی نے اسے یہ کہہ کر جگایا کہ لینڈ لائن

پراس کے آفس کی طرف سے کال ہے۔ وہ آنکھیں ملتے ہوئے فون کی طرف گیا اور ریسیور کان سے لگا کر جمائی لیتے ہوئے بولا، "السلام وعلیکم جی"

فون پر اس کے سلام کا جواب دینے والا کمپنی کا آر ڈی تھا۔

"میں لیٹ کمنگ اور لیٹ سٹنگ کو پسند نہیں کرتا سمیر میاں، جلدی آفس پہنچو" اس نے سمیر کی بات بھی نہ سنی۔ ورنہ سمیر تو یہی کہتا، "کون سا آفس اور تم کون"۔ اس کے ابا اسے ڈراپ کرنے کے لیے بے تاب ہو رہے تھے۔ اس نے انہیں بتایا کہ وہ کمپنی جائن نہیں کرے گا مگر انہوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا، "بیٹا جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر ناشتہ کرو اور تیار ہو جاؤ،"۔ انہوں نے اس کی کوئی بات نہ سنی۔ وہ ایسا نہیں کیا کرتے تھے کیونکہ وہ ہمیشہ سمیر سے رائے لے کر ہی اس کے معاملات طے کرتے تھے۔ وہ تیار تو ہو گیا مگر اس نے ابا کو قائل کرنے کی پوری کوشش کی کہ وہ یہ کمپنی جائن نہیں کر سکتا۔ شائد وہ ان کے معیار پر پورا نہیں اترا یا شائد آر ڈی کو اس کی شخصیت پسند نہیں آئی۔ مگر وہ بدل نخواستہ ابا کے ساتھ آفس پہنچ گیا۔ آر ڈی نے انہیں ویلکم تو کہا مگر اپنی کرسی سے ذرا برابر بھی ہلنے کی کوشش نہ کی جیسے اس طرح اس کی توہین ہو جائے گی اور یہ بات سمیر کے لیے پہلے سے زیادہ ناگوار تھی کیونکہ اب کی بار اس کے ابا بھی اس کے ساتھ تھے اور ان کا احترام تو لازم تھا اور آر ڈی نے اسے خود بلایا تھا۔

" کیوں سمیر میاں تم کیا سمجھتے ہو کہ تم دوسرے لوگوں سے مختلف ہو؟ بیٹا احساس برتری احساسِ کمتری سے زیادہ خطرناک بیماری ہے اور تم یہ چاہتے ہو کہ تمہیں اسپیشل طریقے سے ٹریٹ کیا جائے، یہ نہیں ہو سکتا۔ اگر تم نے کامیابی سے زندگی گزارنا سیکھ لیا ہے تو پھر اسے کامیابی سے گزارو۔ مراعات پہ نظر نہ رکھو۔ پہلا اور آخری اسپیشل ٹریٹ میں جو تمہیں دے سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ میں خود تمہیں آفس کے لوگوں سے متعارف کراتا ہوں۔ اس نے گھنٹی بجائی اور پیئن اندر داخل ہوا۔ " میں نے آفس کا راؤنڈ لینا ہے " آرڈی نے پیئن کو مخاطب کیا۔

" جی بہتر سر " یہ کہہ کر پیئن کمرے سے باہر گیا اور کچھ ہی دیر میں وہیل چیئر کے ساتھ دوبارہ داخل ہوا۔ اس نے آرڈی کو وہیل چیئر میں بٹھا دیا۔ سمیر یہ سارا منظر بڑی حیرت کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ آرڈی نے سمیر اور اس کے ابا کو اپنے ساتھ آنے کو کہا اور خود وہیل چیئر چلاتا ہوا آگے کو بڑھا۔ آرڈی کی سیٹ پر بیٹھنے والا یہ شخص کسی کے احترام میں کھڑا نہیں ہو سکتا تھا مگر اس آرگنائزیشن کو اسی نے اپنے پاؤں پر کھڑا کیا تھا۔ اسپیشل ٹریٹمنٹ دینا اور لینا اس کے ہاں بے اصولی تھی۔

خالہ خدیجہ

وہ آج پھر اپنا ایک اور محافظ دھرتی کی آن بان کے لیے وقف کر چکی تھی۔ وہ خود ماں تھی مگر اپنی ماں دھرتی کو اپنے اوپر مقدم رکھتی تھی اور اس ماں کی گود آباد رکھنے کے لیے پرعزم تھی۔

میں جب بھی اس سے ملنے جاتا تو وہ گئے دنوں کی کوئی نہ کوئی بات مجھے سناتی اور میں اپنی آنکھوں میں آنسو چھپائے، نظریں جھکائے اس کی بات سنتا اور اس پر یہ ظاہر نہ ہونے دیتا کہ میرا دل بھی غم سے پھٹا جا رہا ہے۔ مجھے لگتا کہ اگر میں نے اپنا غم بھی اس پر ظہر کر دیا تو وہ اور بھی غمدیدہ ہو جائے گی۔

خالہ خدیجہ کا گھر میرے گھر سے چند گز کے فاصلے پر ہی تھا۔ گاؤں کی عورتیں اپنے اور اپنے بچوں کے کپڑے اسی سے سلوایا کرتی تھیں۔

میں جب بھی اس سے ملنے گیا اسے سلائی مشین کے پاس ہی بیٹھا پایا۔ مجھے تو خالہ خدیجہ کے قدبت کا بھی اندازہ نہ تھا کیونکہ وہ وہاں سے اٹھتی ہی نہ تھی۔ اپنے گھر بلکہ گاؤں سے بھی دور اگر کوئی خالہ خدیجہ کا ذکر کرتا یا اس کی

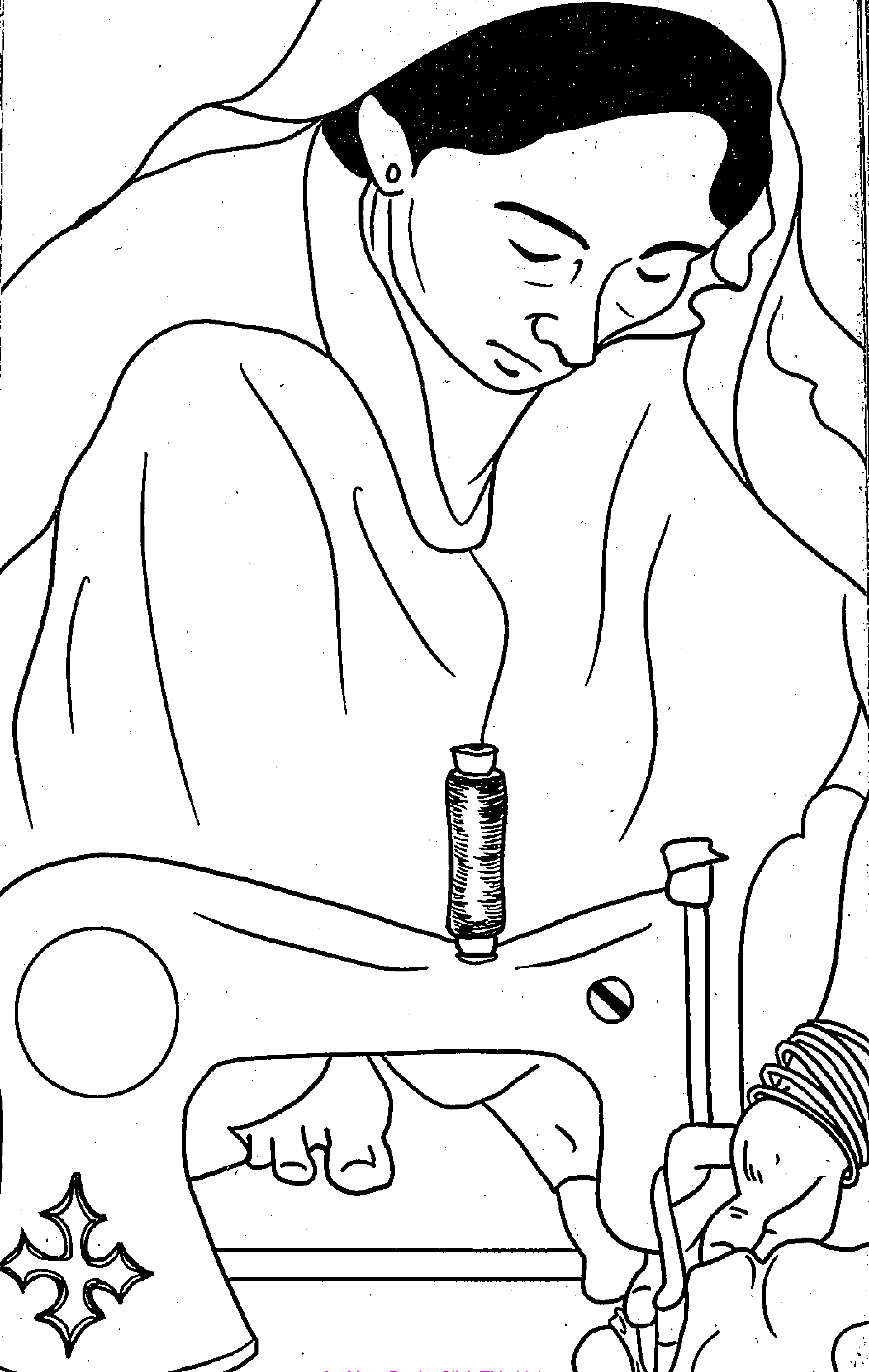
داستانِ غم سناتا تو میری آنکھوں کے سامنے سلائی مشین پر جھکی ہوئی ایک عورت ہی آتی۔

میرے پڑوس میں اس کا میکہ تھا اور وہی اس کا گھر تھا۔ وہ اپنے ماں باپ کے گھر میں ہی ایک طرف چھوٹے سے کمرے میں، اپنے اکلوتے بیٹے خالد کے ساتھ رہتی تھی۔

خالد ہی وہ واحد امید تھی جس کے بل بوتے پر وہ دوبارہ زندہ ہوئی تھی اور اسی کے سہارے وہ اپنی نیم مردہ روح، غموں سے چور دل ودماغ اور خستہ حال جسم کے ساتھ پاکستان پہنچی تھی۔

یہ واقعہ 47 کا نہیں 72 کا تھا، جب خالہ نہیں بیس برس کی خدیجہ تھی۔ 1971 کی جنگ کے وقت وہ اپنے خاوند کے ہمراہ بنگال میں تھی۔ اس کا خاوند فوج میں حوالدار تھا اور وہ اس کے ساتھ بنگال دیکھنے گئی تھی۔ اس وقت اس کی تین برس کی بیٹی ہی تھی، جسے وہ لوگ پیار سے گڑیا کہتے تھے۔ خالہ خدیجہ بتاتی کہ وہ صرف کہنے کو گڑیا نہ تھی، دکھنے میں بھی بالکل گڑیا تھی اور پھر ہر ماں باپ کو اپنی بیٹی گڑیا ہی تو ہوتی ہے۔ اس کے خاوند نے اسے بنگال اس لیے بلایا تھا کہ ایک تو وہ اسے دریاؤں کی سرزمین بنگال کی سیر کرائے اور دوسرا وہ اپنی گڑیا کو اپنے قریب رکھ سکے، اس سے کھیل سکے۔

اس نوجوان جوڑے کو اپنی گڑیا کے ساتھ رہتے صرف تین ماہ ہی



گزر رہے تھے کہ سقوطِ ڈھاکہ کی قیامت بپا ہوئی۔ بھائیوں نے بھائیوں کو کاٹا، یہاں تک کہ مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان سے کاٹ دیا گیا۔ مختلف محاذوں پر پاک بھارت جنگ چھڑی ہوئی تھی اور ہمیشہ کی طرح نقصان عام آدمی کا ہی ہو رہا تھا۔ غیر بنگالیوں کو مارنے کا سلسلہ جاری تھا۔ خالہ خدیجہ کا خاوند ان لوگوں میں شامل تھا جن کے نزدیک ہتھیار پھینکنے کی بجائے کٹ مرنا مقدم تھا اور وہ اسی راستے پر چلتا ہوا شہید ہو گیا۔

خالہ خدیجہ اپنی بیٹی کے ہمراہ پنجاب جانے والے ایک گروپ کے ساتھ سفر پر روانہ ہو گئی۔ ان لوگوں کا منصوبہ یہ تھا کہ کشتی کے ذریعے کراچی کی طرف روانہ ہوا جائے۔ کشتی کا بندوبست بھی کر لیا گیا۔ مگر اس وقت بنگالی کے لیے غیر بنگالی اتنا ہی قابلِ نفرت ہو چکا تھا جتنا اس سے پہلے مغربی پاکستان والوں کے لیے "بھوکا بنگالی"۔

مانجھی نے کشتی والوں کی بجائے کسی اور سے ہی وفاداری نباہی۔ وہ اسے چلنے کو کہہ رہے تھے مگر وہ کسی کے انتظار میں تھا اور کچھ ہی دیر میں وہ لوگ وہاں پہنچ گئے جن کا وہ انتظار کر رہا تھا۔ وہ سب لاٹھیوں، کلہاڑیوں اور خنجروں سے لیس تھے اور تعداد میں کافی زیادہ تھے۔ کشتی والوں نے جب یہ دیکھا تو بھاگ کر جان بچانے کی بجائے مقابلے کو ترجیح دی، اگرچہ وہ غیر مسلح تھے۔ خالہ خدیجہ نے بھاگ کر جان بچائی اور ایک جھاڑی کے پیچھے جا کر چھپ

گئی۔ وہ وہاں سے یہ دیکھ سکتی تھی کہ کشتی والوں میں سے اکثر کو قتل کر کے پانی میں پھینکا جا رہا تھا۔ شائد حملہ آوروں نے تمام کشتی والوں کو ہلاک کر دیا تھا اور اب وہ وہاں سے جا چکے تھے۔

خدیجہ کی سمجھ میں اگر کچھ آیا تو یہی آیا کہ اپنی بیٹی جسے دو دن سے بخار تھا کو یہاں سے لے کر کسی طرف چل پڑے اور وہ چل پڑی۔ اس کی بیٹی باپ کے متعلق پوچھتی تھی کہ ابا کہاں گئے ہیں۔ مگر خدیجہ کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔

وہ بس چلے جا رہی تھی۔ راستے کا کچھ پتہ تھا اور نہ منزل کی کوئی خبر۔ ہر طرف ویرانہ یوں پھیلا ہوا تھا جیسے ساری دنیا ویران ہو گئی ہو، آبادیاں مٹ چکی ہیں اور یہ بے سہارا ماں اور بیمار بیٹی جیسے دنیا کے آخری انسان ہوں۔

خالہ خدیجہ بیٹی کے معصوم سوال سنتی، کچھ کا جواب دیتی اور باقی پر بس چپ سادھ لیتی۔ اب تو سورج بھی ان کا ساتھ چھوڑ رہا تھا، خوش قسمتی سے ایک چشمہ نظر آیا۔ پانی تو گدلہ ہی تھا مگر اس وقت یہی آبِ حیات تھا۔ خالہ خدیجہ نے ہاتھ کے چلو سے پہلے بیٹی کو اور پھر خود پانی پیا۔ وہ اپنی بیٹی کو لیے ایک طرف بیٹھ گئی۔ آگے سفر مشکل تھا کیونکہ بچی بخار کی وجہ سے چل نہ سکتی تھی اور اسے اٹھا کر چلنا ماں کے بس میں نہ تھا۔

رات پھیل چکی تھی اور ستارے اسی طرح ٹمٹما رہے تھے جیسے خدیجہ کے

گاؤں کے اوپر ٹمٹایا کرتے تھے۔ مگر گاؤں کی طرح یہاں کوئی اپنا نہ تھا۔ وہ آسمان کی طرف دیکھتی، کبھی تارے گننے کے لیے، کبھی دعا کے لیے اور کبھی پو پھٹنے کے انتظار میں۔ بھوک اور خوف کی حالت میں تو نیند بھی ضدی بچے کی طرح روٹھ جاتی ہے۔

صبح ہو چکی تھی۔ خدیجہ کا اپنا حال تو جیسا کیسا تھا، اگلے دن تک بچی کی حالت بگڑ چکی تھی۔ "اماں کچھ کھانے کو دو۔۔۔۔کھانے کو کچھ نہیں، سخت بھوک لگی ہے"۔ خدیجہ یہ فریاد سن ہی سکتی تھی، اس کی دادرسی اس کے بس میں نہ تھی۔ اس نے ادھر ادھر بہت نگاہ دوڑائی کہ کچھ کھانے کو میسر آ سکے مگر ویرانگی کے سوا کچھ نہ تھا۔

اپنی داستان سناتے سناتے خالہ خدیجہ رو پڑی۔ انیس بیس برس پہلے لگے زخموں سے شائد ایک بار پھر خون رسنے لگا تھا اور وہ کراہ رہی تھی۔ وہ بہت کچھ سنانا چاہتی تھی مگر اس کی ہمت جواب دے چکی تھی۔ اس نے روداد کو بہت مختصر کر دیا۔

گڑیا نے اس سے سوال کرنا چھوڑ دیے تھے۔ وہ اسے بلانا چاہتی تھی مگر گڑیا شائد روٹھ گئی تھی۔ پھر یہ ناراضی دائمی ناراضی میں تبدیل ہو گئی۔ بخار، بھوک، تھکاوٹ اور خوف کی وجہ سے گڑیا اس کی آنکھوں کے سامنے دم توڑ گئی۔ اس معصوم کی موت پر سوائے اس کی ماں کے نہ تو کوئی رونے والا تھا

اور نہ کوئی اس کی ماں کو دلاسا دینے والا، اس بدنصیب کی نماز جنازہ پڑھ کر اس کو دفنانے والا بھی کوئی نہ تھا، سارے کام دکھیاری ماں نے خود ہی کرنے تھے اور اسی نے کیے۔ خدیجہ نے اپنے سر سے دوپٹہ اتار کر بیٹی کو اس میں لپیٹا اور گڑھا کھود کر دفنا دیا۔ ماں کے ہاتھوں ہی بیٹی کا ایسا کفن دفن۔۔۔۔۔خالہ خدیجہ سسکیوں میں ڈوب گئی۔

اس نے ہمت کر کے آگے سنانا شروع کیا۔

بھوک، پیاس اور غم سے نڈھال اس بے سہارا عورت نے کسی آبادی کی تلاش میں سفر جاری رکھا۔ اگلی رات بھی سر پر تھی کہ اسے دور ایک گھر نظر آیا۔ وہ خیر و شر سے بے نیاز زندگی کی تلاش میں آگے بڑھی۔ صحن میں ایک بڑی عمر کی عورت اور اس کا خاوند بیٹھے تھے۔ خدیجہ کے دل سے آواز اٹھی، "اب یہ بنگالی خدا جانے تمہارے ساتھ کیا کریں، انھوں نے تم سے تمہارا خاوند اور بیٹی دونوں چھین لیے"۔

لیکن اب شائد موت اس کے لیے خوف کی بجائے ایک امید بن چکی تھی اور وہ اسی امید کے ساتھ اس گھر کے صحن تک پہنچ گئی۔ اس کی توقعات کے برعکس ان میاں بیوی نے اسے خوش آمدید کہا۔ اس کی زبوں حالی بالکل واضح تھی۔ جب بزرگ شخص، جس کا نام شہاب تھا، نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھا تو وہ زار و قطار رونے لگی۔ شائد زندگی پر اس کا اعتماد

بحال ہو گیا تھا۔ اس نے سسکیوں اور آہوں میں اپنی روداد انہیں سنا ڈالی۔ اب وہ اکیلی نہیں رو رہی تھی۔ اس کے ساتھ رونے والے موجود تھے۔ بڑی بی نے اسے کھانے کے لیے کچھ دیا اور اتنے میں ان کی دو بیٹیاں بھی آ گئیں۔ بس ان کی دو بیٹیاں ہی تھیں۔ بیٹیوں کے والدین ہونے کی وجہ سے وہ اس بیٹی کا درد بھی بخوبی سمجھتے تھے۔ بڑے میاں نے ان سب کو تاکید کی کہ وہ خدیجہ کی موجودگی کے بارے میں کسی کو نہ بتائیں ورنہ بڑی مصیبت آ سکتی ہے۔ "یہ دکھیاری ہمارے پاس اللہ کی امانت ہے اور ہم نے اس کی حفاظت کرنی ہے"۔

خدیجہ اس جگہ کا راستہ بھی بھول چکی تھی جہاں اس نے اپنی بیٹی دفنائی تھی۔ اگلے دن نہ جانے غیر بنگالیوں کا قلع قمع کرنے والوں کو کیسے خبر ہو گئی کہ شہاب کے ہاں کوئی پنجابی لڑکی ٹھہری ہوئی ہے۔ وہ یہاں آن دھمکے۔ شہاب اور اس کی بیوی نے خدیجہ کو بہت سارے بستروں کے نیچے چھپا دیا۔ بلوائیوں نے گھر کا جائزہ لیا اور انہیں یقین ہو گیا کہ انہیں غلط فہمی ہوئی ہے اور خوش قسمتی سے وہ وہاں سے چلے گئے۔ اب خدیجہ دن کے وقت ایک کوٹھڑی میں ہی رہتی اور وہ رات کو ہی باہر آتی۔ شہاب اور اس کی بیوی اسے اپنی تیسری بیٹی سمجھتے جو کہ بیوہ اور بے اولاد ہو چکی تھی۔ یہ لوگ غیروں کے قافلے میں اپنے تھے۔ ان جیسے بہت سارے اپنے تھے جن میں سے بہت

ساروں کو ہمارا ہونے کی بڑی کڑی سزا دی گئی۔

ایک امید جو زندگی کا سہارا تھی اس کے شکم میں موجود تھی۔ وہ اسی امید کی خاطر جینا چاہتی تھی اور اس کا اندازہ شہاب کی بیوی کو بھی ہو چکا تھا اور وہ اس وجہ سے اس کا بہت خیال رکھتی تھی۔ جب فساد کا طوفان کچھ تھما تو شہاب نے معلومات حاصل کرنا شروع کیں کہ کس طرح خدیجہ کو پاکستان بھجوایا جائے۔ آخر کار وہ اپنی کوششوں میں کامیاب ہو گیا اور اس نے خدیجہ کو پورا طریقہ کار سمجھا دیا۔ خدیجہ کو کراچی میں اپنے ماموں کا پتہ یاد تھا اور اس نے انہیں خط لکھ چھوڑا کہ وہ کچھ عرصے میں پاکستان پہنچ جائے گی۔ شہاب نے اپنے منصوبے کے مطابق خدیجہ کو کراچی جانے والے بحری جہاز میں بٹھا دیا۔

غموں کی ماری خدیجہ، تن تنہا اور خالی گود کراچی کے ساحل پر اتری اور کچھ تلاش کے بعد اپنے ماموں کے ہاں پہنچی اور اس کے بعد ماموں کے ہمراہ اپنے دیس، اپنے گاؤں پہنچ گئی۔ چند ماہ کے بعد اس کے ہاں بیٹے کی پیدائش ہوئی اور اس کی امیدیں، آسیں تر و تازہ ہو گئیں۔ سب کچھ چھن جانے کے باوجود اب وہ جینا چاہتی تھی، اپنے لیے نہیں، اپنے بیٹے کی خاطر جس کا نام اس نے خالد رکھا۔

خالہ خدیجہ نے خالد کی خاطر محنت مزدوری کا آغاز کیا۔ وہ بڑی

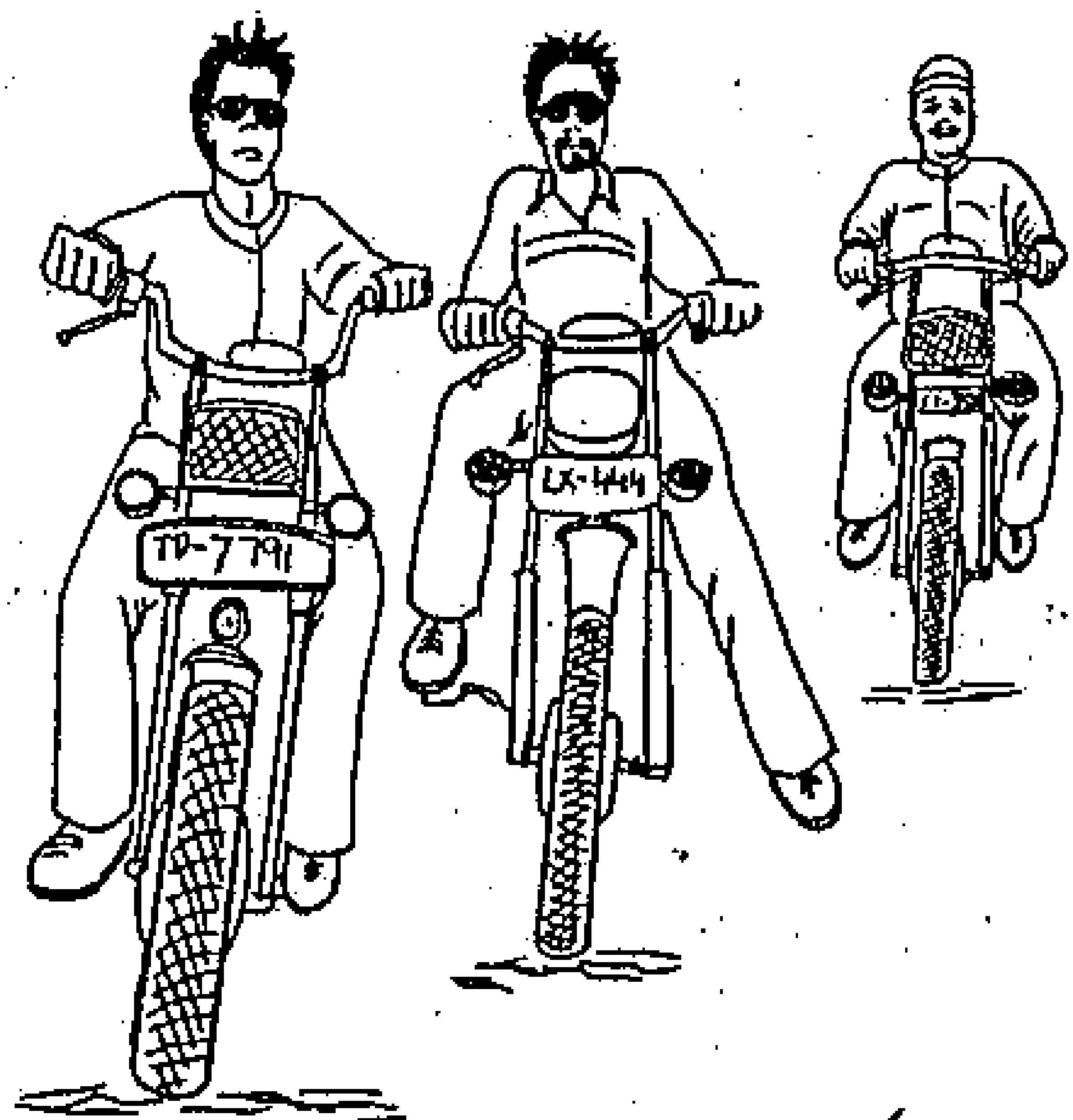
خود دار تھی اور اپنے ماں باپ اور بھائیوں پر بوجھ نہیں بننا چاہتی تھی۔ اس کی ماں نے بچپن میں جو سینا پرونا اسے سکھایا تھا وہ اس کے کام آیا۔ خالہ خدیجہ گاؤں کی عورتوں اور بچوں کے کپڑے سینے لگی۔ اس نے اسی مزدوری سے خالد کو پڑھایا لکھایا اور جوان کیا۔ خالہ خدیجہ کو اپنے ماں باپ کے گھر ایک چھوٹی سی کوٹھڑی ہی کافی تھی۔ کچھ عرصہ بعد ہمت کر کے اس نے تھوڑی سی زمین لے کر گھر کی بنیادیں بھی ڈال دیں۔ خالد نے انٹر پاس کیا اور ماں کی ہدایت پر فوج میں بھرتی کی تیاری کرنے لگا۔ ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب کی بریفنگ کے بعد اس نے آئی ایس ایس بی کے لیے مکمل تیاری کی اور پہلی بار ہی اس میں کامیاب ہو گیا۔ مشرقی پاکستان میں شہید ہونے والے حوالدار اور اس کی بیوہ خدیجہ کا بیٹا اس دھرتی کی حرمت کے تحفظ کے لیے کمر کس چکا تھا۔



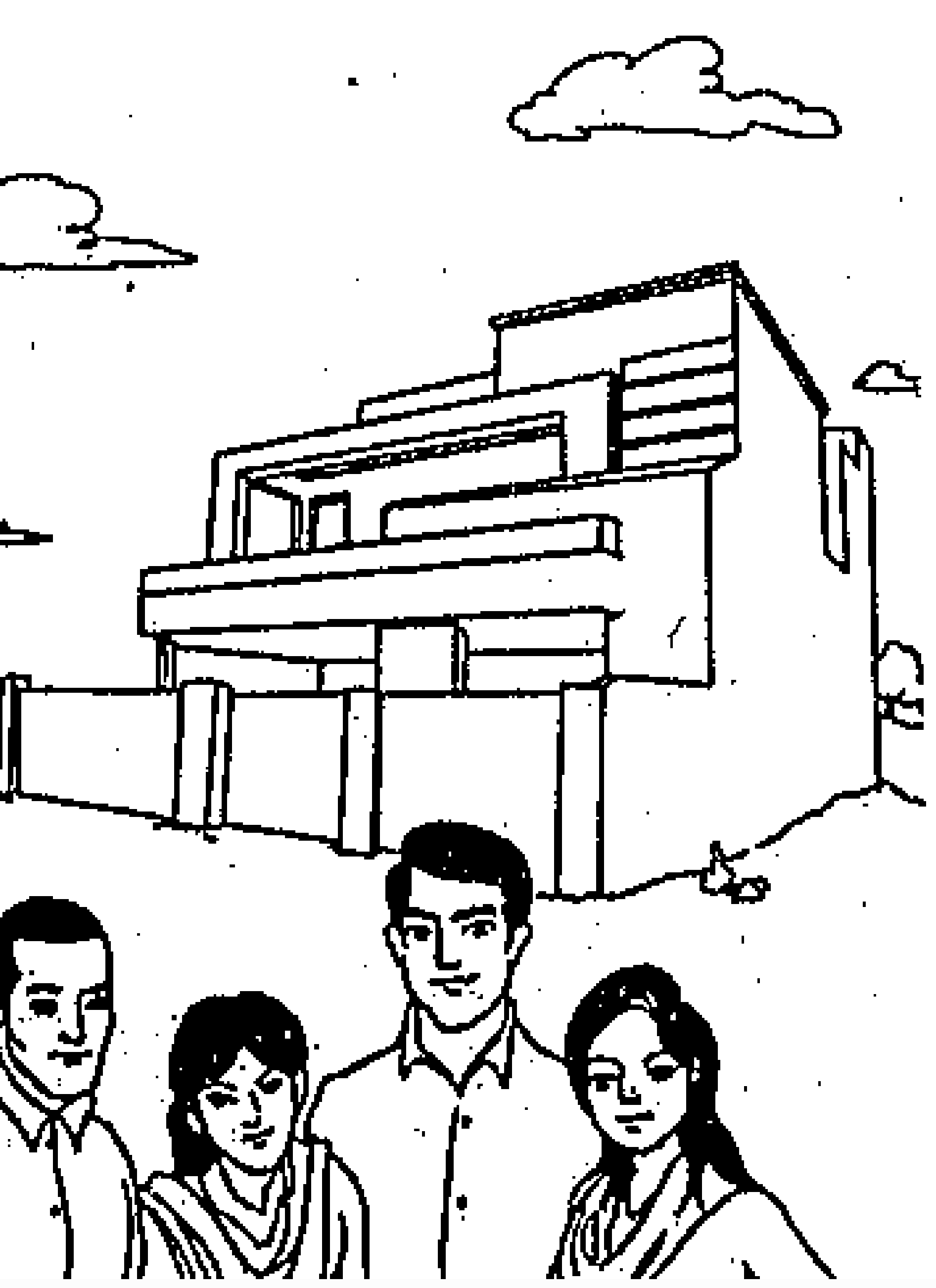




بڑے بچوں کی
کردار سازی اور شخصیت سازی
کے لیے ایک مفید کتاب



عام لوگوں کی
خاص کہانیاں






بڑے بچوں کی
کردار سازی اور شخصیت سازی
کے لیے ایک مفید کتاب
عام لوگوں کی
خاص کہانیاں
NATIONAL BOOK FOUNDATION
امن انقلاب بذریعہ کتاب
BOOK REVOLUTION



جواد اقبال جواد

خطہ پوٹھوہار سے تعلق۔ 2005ء میں نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد سے انگریزی ادب ولسانیات میں ماسٹرز کیا۔ اسی سال ایڈورٹائزنگ کے شعبہ میں بطورِ کاپی رائٹر عملی زندگی کا آغاز کیا اور تا حال اسی شعبہ سے وابستہ ہیں۔ اسلام آباد کی مختلف ایڈورٹائزنگ ایجنسیوں کے لیے کاپی رائٹر اور ہیڈ آف کری ایٹیو ڈیپارٹمنٹ کی حیثیت سے کام کرنے کے ساتھ ساتھ پاکستان ٹیلی ویژن کے لیے بھی سکرپٹ لکھتے ہیں۔ متعدد اردو اور انگریزی قومی اخبارات کے لیے کالم اور قطعات بھی مصنف کی تخلیقی کاوشوں کا حصہ ہیں۔ 2007ء میں بچوں کے ادب کی تخلیق کے سلسلے میں نظموں کا مجموعہ "بچو مانو اچھی بات" پر نیشنل بک فاؤنڈیشن سے تیسرا ایوارڈ حاصل کیا۔ کہانی اور افسانہ نگاری کے علاوہ جواد اقبال جواد کی وجہ شہرت اردو، پنجابی اور پوٹھوہاری شاعری بھی ہے۔

BOOKS GIVE US WINGS — NATIONAL BOOK FOUNDATION

Price: Rs. 60/-